ڈاکٹر

عبادت بریلوی

غالب کا فن

غالب کا فن

ڈاکٹر عبادت بریلوی

پروفیسر و صدر شعبۂ اردو پنجاب یونیورسٹی لاہور

گلوب پبلشرز لاہور

لوہاری گیٹ فون ۶۲۲۶۳

طابع	عبدالحمید نظامی
اہتمام	قیوم نظامی ایم اے
مطبع	اردو ڈائجسٹ پرنٹرز
تعداد	گیارہ سو
قیمت	دس روپے
خوشنویس	عبدالسلام بی اے



مزاج دانِ فکر و فنِ غالب

برادرِ گرامی قدر

جناب پروفیسر حمید احمد خاں صاحب

کی نذر

خوشا لطافتِ اندازۂ ادافہمی
زہے نزاکتِ اندازِ مدّعا دانی

(غالب)

ترتیب

پیش لفظ

غالب ایک عظیم شاعر ہیں اور ان کی اس عظمت کا راز اِس میں ہے کہ اُنہوں نے اردو شاعری کی روایت میں ایک نئی روح پھونکی ہے۔ اس کو ایک نئی زندگی دی ہے۔ اس میں ایک نیا انقلاب پیدا کیا ہے۔ تبدیلی کی ایک نئی لہر دوڑائی ہے۔ اُس کو نئے راستوں پر گامزن کیا ہے۔ نئی منزلوں کی طرف بڑھایا ہے بلکہ نئے آسمانوں پر پرواز سکھائی ہے۔ وہ اردو شاعری کے مُجتہد بھی ہیں مجدّد بھی۔ اُن کا بنیادی موضوع انسان اور انسانیت ہے۔ اُنہوں نے اسی انسان اور انسانیت کے بنیادی انفرادی اور اجتماعی معاملات و مسائل کو بڑی گہرائی اور گیرائی کے ساتھ اپنی شاعری میں سمویا ہے۔ اس طرح اردو شاعری اُن کے ہاتھوں ایک آفاقی رنگ اور ایک فکری آہنگ سے

آشنا ہوئی ہے اور اس کو ایک ذہن و شعور ملا ہے۔ وہ اردو کے پہلے فلسفی شاعر ہیں۔ لیکن ان کی شاعری صرف فلسفہ نہیں ہے۔ اس فلسفے کو انہوں نے تجربے کے سانچے میں کچھ اس طرح ڈھالا ہے اور تخیل کے رنگوں سے اس کو کچھ اس طرح سجایا ہے کہ اس میں حسن و جمال کی ایک دنیا آباد ہو گئی ہے۔ اور حسن و جمال کی اس دنیا نے انہیں ایک بہت بڑا فن کار اور ایک اعلیٰ درجے کا خالقِ جمال ثابت کر دیا ہے۔

یہ عجیب بات ہے کہ گذشتہ سو سال میں غالب کی شخصیت اور شاعری کے مختلف پہلوؤں پر بیسیوں کتابیں لکھی جا چکی ہیں اور سینکڑوں مضامین و مقالات قلم بند کئے جا چکے ہیں لیکن اُن کی فن کاری اور تخلیق جمال کے پہلو پر ان کتابوں اور مقالوں میں کوئی خاص توجہ نہیں دی گئی ہے۔ کہیں کہیں ان کی فن کاری کا ذکر ہُوا ضرور ہے۔ اس کی تحسین و تعریف میں چند فقرے اور جملے بھی لکھے گئے ہیں لیکن ان پہلوؤں کا تنقیدی تجزیہ، جس طرح ہونا چاہیے تھا، نہیں ہو سکا ہے غالب کی شخصیت اور شاعری کے متعلق تحقیقی اور تنقیدی تحریروں کا مطالعہ کرتے وقت یہ کمی کانٹے کی طرح کھٹکتی ہے۔

اس احساس ہی نے میرے دل میں اس خیال کی شمع روشن کی کہ میں غالب کی تخلیق جمال کے عوامل اور محرکات کا سُراغ لگاؤں اور اس کے مختلف عناصر کا تنقیدی تجزیہ کروں۔ یہ کتاب "غالب کا فن" اُن کے اسی تخلیقِ جمال کے عوامل و

محرکات کی تلاش و جستجو کی ایک داستان اور اس کے مختلف عناصر کے تنقیدی تجزیے کی ایک کہانی ہے۔

اس کتاب کو آسانی کے خیال سے دس ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلے باب میں غالب کے فن کی اہمیت کا مختصر سا بیان ہے۔ دوسرے باب میں ان عوامل اور محرکات کی تفصیل ہے جن کے ہاتھوں غالب کے فن کی تشکیل ہوئی ہے۔ تیسرے باب میں موضوع اور فن کی اس ہم آہنگی کا ذکر ہے جس سے غالب کا فن پہچانا جاتا ہے۔ چوتھے باب میں وزن و آہنگ کی تفصیل ہے اور اس حقیقت کا جائزہ ہے کہ اس وزن و آہنگ نے غالب کے فن میں کیا کام کیا ہے۔ پانچویں باب میں اس بات کو واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ روایت کے اثرات نے غالب کے فن کو کس طرح متاثر کیا ہے اور اس نے ان کی شاعری میں کیا صورتیں اختیار کی ہیں۔ چھٹے باب میں علامات و اشارات کے جمالیاتی پہلوؤں پر تنقیدی بحث ہے۔ ساتواں باب رمزیت اور ایمائیت کی جمالیاتی اہمیت کی وضاحت کرتا ہے۔ آٹھویں باب میں غالب کی تصویر کاری، پیکر تراشی یا امیجری پر تفصیلی بحث کی گئی ہے۔ اور ان کی شاعری کے بعض ایسے پہلوؤں کی نقاب کشائی کی گئی ہے جن کی بدولت ان کا فن ایک اچھا خاصا نگارخانہ بن گیا ہے۔ نویں باب میں زبان و بیان کے جمالیاتی پہلوؤں کا تنقیدی جائزہ لیا گیا ہے اور دسویں باب میں اختصار کے ساتھ اس تنقیدی بحث سے نکلنے والے اُن

تمام نتائج کو یک جا کرنے کی کوشش کی گئی ہے جن سے نہ صرف اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ غالب کا سا بلند پایہ خالقِ جمال اور اعلیٰ پائے کا فن کار اردو شاعری میں کوئی اور پیدا نہیں ہوا بلکہ یہ حقیقت بھی واضح ہوتی ہے کہ غالب کے بعد جتنے بھی اہم شاعر گذرے ہیں انھوں نے کسی نہ کسی زاویے سے غالب کا اثر قبول ضرور کیا ہے۔

غالب کے فن اور جمالیاتی پہلو کے اس تنقیدی جائزے کو مکمل نہیں کہا جا سکتا۔ میں نے اپنی سی پوری کوشش ضرور کی ہے کہ غالب کے فن کے تمام خدوخال اس جائزے سے پوری طرح نمایاں ہو کر سامنے آجائیں۔ اِس کوشش نے اس تنقیدی جائزے کو مکمل اور بھرپور نہ سہی لیکن ایک معقول اور بڑی حد تک صحیح مطالعہ ضرور بنا دیا ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ اس میں تفصیل و جزئیات کے عناصر نسبتاً زیادہ نمایاں ہو گئے ہیں۔ بحثیں بھی طویل ہو گئی ہیں۔ تجزیے میں بھی کچھ پھیلاؤ پیدا ہو گیا ہے۔ اشعار کا انتخاب بھی کچھ بڑھ گیا ہے۔ لیکن اس قسم کے تنقیدی اور تجزیاتی مطالعے میں ان پہلوؤں کا پیدا ہونا ایسی کوئی عجیب بات نہیں ہے۔ تنقیدی خیالات کی وضاحت کے لئے اشعار کا انتخاب ضروری ہوتا ہے۔ اس کو مختصر بھی کیا جا سکتا تھا لیکن میں نے ایسا نہیں کیا ہے۔ کیونکہ میرے خیال میں اشعار کے انتخاب کی تنقیدی اہمیت بھی کچھ کم نہیں ہے۔ پھر ایک بات یہ بھی ہے کہ اس قسم

کے تنقیدی جائزے میں شاعر کے اشعار دلوں میں نور اور آنکھوں میں سرور پیدا کرنے کا سامان بھی فراہم کرتے ہیں۔ تنقید اس معاملے میں بے بس ہے۔

اس تنقیدی جائزے میں جو رنگ و آہنگ ہے وہ اردو تنقید میں عام نہیں ہے۔ انگریزی اور بعض دوسری زبانوں میں تو اس قسم کے تنقیدی جائزوں کی خاصی فراوانی ہے لیکن اردو میں ان کی کوئی اہم روایت نہیں ملتی۔ اس طرح دیکھا جائے تو اس تنقیدی جائزے کی حیثیت ایک تجربے کی ہے۔ تجربہ نقشِ اوّل سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا۔ اس نقشِ اوّل میں غالب کے فن اور اس کے جمالیاتی پہلوؤں کی طرف محض چند اشارے کئے گئے ہیں۔ صرف اس خیال سے کہ ان اشاروں کو سامنے رکھ کر دوسروں کو اس راستے پر گامزن ہونے، آگے بڑھنے اور نئی منزلوں سے ہمکنار ہونے، بلکہ نئے آسمانوں پر پرواز کرنے کا موقع ملے گا۔

اور اس طرح وہ کارنامے جو غالب نے اردو شاعری میں انجام دیئے ہیں اور اُن کے ہاتھوں عظمت کی جو شمع اس کی روایت کے شبستانوں میں فروزاں ہوئی ہے وہ اردو تنقید کے ایوانوں کو بھی اپنی مسکراہٹ سے جگمگائے گی۔

اورینٹل کالج لاہور

۲۵ دسمبر ۱۹۶۸ء

عبادت

اهمیت

غالب کی حیثیت اُردو شاعری کے اُفق پر ایک ایسے درخشندہ تارے
کی ہے جس کی دل نشین تھرتھراہٹ ہر حال میں دلوں کو بھاتی ہے۔
وہ صحیح معنوں میں عظیم شاعر ہیں۔ اور ان کی اس عظمت کا راز اس میں
ہے کہ وہ انسانی زندگی کے نشیب و فراز کو شدت کے ساتھ محسوس
کرتے ہیں۔ اس کے مختلف پہلوؤں کا گہرا شعور رکھتے ہیں۔ اس کے بنیادی
معاملات و مسائل پر غور و فکر کرتے ہیں۔ اس کی ان گنت گتھیوں کو سلجھاتے
ہیں۔ انسان کو اس کی عظمت کا احساس دلاتے ہیں۔ اس کو اپنے پیروں
پر کھڑا ہونا سکھاتے ہیں اور نظام حیات و سواد کائنات میں اس کو
نئے آسمانوں پر اُڑاتے ہیں۔ غالب کی شاعری اس اعتبار سے بہت
بلند ہے اور اس میں شبہ نہیں کہ ان کی شاعری کے انہیں عناصر نے
اس کو عظمت سے ہمکنار کیا ہے۔ لیکن جس طرح ان کی شاعری میں

ان سب کا اظہار و ابلاغ ہوا ہے، وہ بھی اس کو عظیم بنانے میں برابر کا شریک ہے۔

یہ اظہار و ابلاغ حسین و دل آویز ہے۔ اس میں حُسن کی ارفع اقدار ہیں۔ جمال کے اعلیٰ معیار ہیں۔ ان میں بڑی ہی رنگینی اور رعنائی ہے۔ بڑا ہی پُرکار انداز ہے۔ اس میں شروع سے آخر تک چھٹکی ہوئی چاندنی کا سا منظر نظر آتا ہے۔ آسمان پر جگمگاتے ہوئے ستاروں کی سی کیفیت دکھائی دیتی ہے۔ کسی شہر میں چراغاں کی سی کیفیت کا سماں معلوم ہوتا ہے۔ قدم قدم پر اس میں گل و گلزار سے کھلتے ہیں۔ کلیاں سی چٹکتی ہیں۔ پھول سے مسکراتے ہیں۔ جھاڑ فانوس سے جگمگاتے ہیں۔ اس میں ایوانوں کی سی رنگینی ہے۔ شبستانوں کی سی پُرکاری ہے۔ اس میں رنگ کے طوفان سے اٹھتے ہیں۔ نور کے سیلاب سے امڈتے ہیں۔ اور جگہ جگہ برسات کے دنوں میں شام کے وقت دور مغرب میں اُفق پر پھولی ہوئی شفق کا سا عالم نظر آتا ہے۔

ان باتوں میں شاعرانہ رنگ اور تاثراتی آہنگ ضرور ہے لیکن مبالغہ نہیں ہے۔ کیونکہ غالب کی شاعری پڑھنے اور سننے والے کے سامنے یہ اور اسی قسم کے ان گنت پیکروں کو سامنے لاکر کھڑا کر دیتی ہے۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کا اثر حواس پر شدید ہوتا ہے۔ وہ ان میں غیر شعوری طور پر ایک ارتعاش کی سی کیفیت پیدا کرتی ہے اور اس ارتعاش کی وجہ سے اس کے پڑھنے اور سننے والے کے ذہن پر اس قسم کی تصویریں ابھرتی ہیں۔

غالب کا اظہار و ابلاغ اپنے موضوع کے ساتھ پوری طرح

ہم آہنگ ہے ۔ ان کے موضوع میں جو وسعتیں اور گہرائیاں ہیں، اس کا عکس ان کے اظہار و ابلاغ میں بھی نظر آتا ہے۔ اَن گنت عناصر کے امتزاج سے اس کی تشکیل ہوتی ہے ۔ اس میں غالب کے تجربے کی کیفیت، جذبات و محسوسات کا مخصوص آہنگ، ادراک و شعور کے نتیجے میں پیدا ہونے والا ایک سنجیدہ انداز، پیچیدہ اور تہہ در تہہ خیالات کے باعث پیدا ہونے والی مخصوص رمزیت اور ایمائیت، علامات و اشارات، استعارات و تشبیہات، تصویر و پیکر اور الفاظ و زبان، سب ہی کچھ شامل ہیں۔

ان تمام عناصر کے مجموعی اور متوازن امتزاج کا نام غالب کا فن ہے جس میں ایک عظیم اور پہلو دار شخصیت کی عکاسی اور ایک رنگین اور پُرکار تہذیب کی ترجمانی خود حُسن و جمال کی اقدار کو چار چاند لگاتی ہیں۔

عوامل اور محرکات

غالب کے فن کو ایک مخصوص تہذیبی روایت نے پیدا کیا ہے۔ اس کی تعمیر و تشکیل میں وہ معاشرتی و تہذیبی اور ذہنی و فکری حالات بھی برابر کے شریک ہیں جن کے سائے میں اس نے آنکھ کھولی ہے اور اپنے سفر کی ارتقائی منزلیں طے کی ہیں۔ وہ غالب کی شخصیت کا آئینہ ہے اور اس آئینے میں نہ صرف ان کی شخصیت کے خدوخال پوری طرح بے نقاب نظر آتے ہیں بلکہ ان حالات کی تصویر بھی دکھائی دیتی ہے جن کے ہاتھوں غالب کی شخصیت کا ہیولا تیار ہوا ہے۔

یہ ایک مانی ہوئی بات ہے کہ غالب اس تہذیب کی آخری یادگار ہیں جس کو اس برعظیم میں مغلوں نے پیدا کیا اور پروان چڑھایا تھا۔ اس میں شبہ نہیں کہ عہد اکبری اور عہد شاہجہانی میں یہ تہذیب اپنے معراج شباب پر نظر آتی ہے۔ اورنگ زیب عالمگیرؒ کے زمانے

میں بھی کم و بیش یہی عالم رہتا ہے لیکن اس کے بعد اس میں انحطاط و زوال کے آثار رونما ہونے لگتے ہیں۔ مغلوں کے دورِ آخر میں انحطاط و زوال کا یہ عمل جاری رہتا ہے اور غالب کے عہد تک آتے آتے تو یہ عمارت انتہائی بوسیدہ معلوم ہونے لگتی ہے۔ البتہ اس کے بام و در زبانِ حال سے یہ کہتے ہوئے سنائی دیتے ہیں کہ یہ ایک عظیم اور شاندار عمارت تھی۔ چنانچہ جو لوگ اس عمارت کے وارث تھے، ان کے یہاں اس کی عظمت کا احساس بڑھ جاتا ہے، اور جو روایات اس کے سائے میں پلی بڑھی اور پروان چڑھی تھیں، ان کی اہمیت کے احساس و شعور میں کچھ اس درجہ اضافہ ہو جاتا ہے کہ وہ انہیں سینے سے چمٹائے رہتے ہیں اور کسی حال میں بھی اس کو چھوڑنے کے لئے تیار نہیں ہوتے۔

غالب اس صورتِ حال کے صحیح ترجمان اور عکاس ہیں۔ انیسویں صدی کی دلّی میں جب مسلمان سیاسی میدان کو تقریباً چھوڑ چکے تھے اور مغل بادشاہ کی حکومت صرف لال قلعے کے اندر محدود ہو کر رہ گئی تھی، غالب اور ان کے ہم عصروں نے تہذیبی روایت کی اس شمع کو فروزاں رکھا جس نے ماضی میں اس برِعظیم کی پوری زندگی کو رنگین اور پُرکار بنا دیا تھا۔ غالب کے زمانے میں اس تہذیبی روایت کی قدریں بھی اپنے معراجِ کمال پر نظر آتی ہیں اور یہ صرف غالب اور ان کے بعض ہم عصروں کا کارنامہ ہے کہ حالی نے اس دور میں ایک دفعہ پھر عہد اکبری اور عہد شاہجہانی کی جھلک دیکھی ہے۔

اس تہذیب میں جو بلندی اور ترفع ہے، جو رنگینی اور پُرکاری ہے، جو جگمگاہٹ اور تابانی ہے، جو رس اور رعنائی ہے اس

کو تاج محل، لال قلعہ اور جامع مسجد کے در و دیوار اور فیضی، عرفی نظیری اور بیدل کے اشعار میں بخوبی دیکھا جا سکتا ہے۔ غالب کے فن اور ان کی شاعری کے جمالیاتی اظہار میں بھی اس تہذیبی روایت کی جھلک اپنی تمام جلوہ سامانیوں کے ساتھ بے نقاب دکھائی دیتی ہے۔ ان کے فن میں جو ایک رنگینی اور پرکاری، جگمگاہٹ اور تابانی، رس اور رعنائی ہے، وہ اسی صورتِ حال کا نتیجہ ہے۔ غالب کے یہاں اس تہذیبی روایت کے گہرے اثرات صرف اس وجہ سے نظر آتے ہیں کہ اس دور میں اس روایت کی عظمت کا احساس افراد میں کچھ زیادہ ہی شدید ہو گیا تھا۔ انحطاط و زوال جب انتہا کو پہنچ جائے تو یہی صورتِ حال پیدا ہوتی ہے۔ غالب اس کے صحیح علم بردار ہیں اور ان کا فن اور جمالیاتی اظہار اس کا صحیح آئینہ دار!

یہ تہذیبی روایت بقول حالی عہد اکبری اور عہد شاہجہانی کی یاد اس وجہ سے بھی دلاتی ہے کہ اس زمانے میں اپنے آپ کو پانے اور اپنی سیاسی اور تہذیبی عظمت کے جگر لخت لخت کو ایک دفعہ پھر جمع کرنے کی کوشش بعض ایسی تحریکوں کی صورت میں موجود تھی جن کی نوعیت بہ یک وقت سیاسی اور معاشرتی بھی تھی اور دینی و تہذیبی بھی۔ ان میں مولانا سید احمد بریلویؒ اور مولانا اسمٰعیل شہیدؒ کی تحریک جہاد کو نمایاں حیثیت حاصل ہے۔ اس تحریک نے مجموعی طور پر اس معاشرے میں جو ماحول پیدا کیا تھا، اس کے اثرات مخالفین تک پر موجود تھے۔ غالب کو مولانا سید احمد بریلویؒ کی تحریک سے اختلاف تھا۔ وہ مولانا فضل حق خیر آبادی کے دوست اور ہم نوا

تھے لیکن جولانی اور ولولہ انگیزی کی جو فضا اس تحریک نے اس زمانے کی دِلّی میں پیدا کر دی تھی، اس نے غالب کو بھی متاثر کیا اور ان کے فن میں باوجود غم عشق، غم حیات اور غمِ روزگار کے پیدا ہونے والی الم انگیزی کے، وہ جو ایک ولولہ انگیزی اور جولانی ملتی ہے اور اس کے نتیجے میں ایک شگفتگی اور شادابی کا جو احساس ہوتا ہے، وہ اسی تحریک کی آتش افشانی اور شعلہ سامانی کا نتیجہ ہے۔ غالب کے فن اور اُن کے جمالیاتی اظہار میں نشاطیہ رنگ اور طربیہ آہنگ کی جو چاندنی سی مسکراتی ہے، اس کو بھی بالواسطہ طور پر جوشش اور ولولے کی اس فضا ہی نے پیدا کیا ہے جو ان نیم مذہبی اور نیم سیاسی تحریکوں کے ہاتھوں وجود میں آئی تھی۔

غالب کے ادبی ماحول نے بھی ان کے فن اور جمالیاتی اظہار کی تشکیل و تعمیر میں نمایاں حصہ لیا ہے۔ اُردو غزل میں غالب سے قبل میرؔ کی قائم کی ہوئی روایت شاید سب سے زیادہ اُستوار تھی۔ غالب نے اس کا اعتراف بھی کیا ہے۔ میرؔ کی استادی ان کے نزدیک مسلّم ہے۔ وہ انہیں بڑا شاعر مانتے تھے اور ان کے خیال میں جو ان کی استادی کو تسلیم نہیں کرتا وہ خود بے بہرہ ہے۔

ریختے کے تمہیں استاد نہیں ہو غالب
کہتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میر بھی تھا

غالب اپنا یہ عقیدہ ہے بقول ناسخ
آپ بے بہرہ ہے جو معتقدِ میر نہیں

لیکن میر کی روایت کے اثرات غالب کے فن میں نہ ہونے کے برابر ہیں۔ میر کے یہاں موضوع کی سنجیدگی کے نتیجے میں پیدا ہونے والی ثقاہت ہے۔ ان کا فن بڑا ہی مہذب فن ہے۔ سادگی اس کی سب سے بڑی خصوصیت ہے۔ وہ سہل ممتنع ہے۔ اس میں کوئی پیچ در پیچ اور تہ در تہ کیفیت نہیں ہے اور اس کا سبب یہ ہے کہ وہ ایک ایسے دور کی پیداوار ہے جس میں خود کوئی پُرپیچ کیفیت نہیں تھی۔ زندگی کا انداز بدل گیا تھا۔ حوادثِ زمانہ نے اس کی صورت بگاڑ دی تھی لیکن افراد نے اس تبدیلی کو سمجھا نہیں تھا۔ انہیں معلوم نہیں تھا کہ یہ سب کچھ کیوں ہو رہا ہے، کیسے ہو رہا ہے، اس کے نتائج کیا ہوں گے اور اس سے دامن بچانے کے لئے کیا کرنا چاہیئے؟ شاید یہی وجہ ہے کہ اس فنی روایت میں بے باکی نہیں ہے۔ تیزی اور تندی نہیں ہے۔ شگفتگی اور شادابی نہیں ہے۔ بلندی اور بلند آہنگی نہیں ہے۔ برخلاف اس کے ایک حجاب کی سی کیفیت ہے، ایک آہستہ روی ہے اور ایک شدید المیہ رنگ اور حُزنیہ آہنگ ہے۔ غالب نے اس روایت سے کوئی خاص اثر قبول نہیں کیا ہے۔

البتہ میرؔ کی روایت سے ملی ہوئی ایک اور روایت اُردو غزل میں ایسی ہے جس کے اثرات کی جھلک کہیں کہیں غالب کے فن میں نظر آتی ہے۔ یہ روایت مُصحفی، انشا اور جرأت کی قائم کی ہوئی روایت ہے۔ اس میں نسبتاً زیادہ شگفتگی اور شادابی کا احساس ہوتا ہے۔ زیادہ حوصلہ مندی اور ولولہ انگیزی نظر آتی ہے۔ ایک نشاطیہ رنگ و آہنگ

دکھائی دیتا ہے جس کی حدیں کہیں کہیں عُریانی اور ابتذال سے بھی جا ملتی ہیں۔ غالب نے اس روایت سے کسی حد تک اثر ضرور لیا ہے یہ اور بات ہے کہ انھوں نے اپنے فن میں اس روایت کے اثر کو زیادہ مہذب بنا دیا ہے اور اس میں زیادہ لئے دیئے رہنے والی کیفیت پیدا کر دی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ غالب کے فن میں شگفتگی اور شادابی حوصلہ مندی اور ولولہ انگیزی، نشاطیہ رنگ اور طربیہ آہنگ کے باوجود عُریانی اور ابتذال کا شائبہ تک نہیں ہوتا۔

یہ فنی روایت، ظاہر ہے کہ لکھنؤ کے تعیش پسندانہ اور عیش پرستانہ معاشرے کا منطقی نتیجہ تھی۔ اس کا آغاز تو انشار اور جرأت کے ہاتھوں ہوا اور ان کے بعد لکھنؤ کے دوسرے شعراء اس راستے پر بہت آگے نکل گئے۔ آتش کے ایسے ثقہ شاعر کے یہاں بھی ان اثرات کی جھلک کہیں کہیں نظر آتی ہے۔ ناسخ بھی اس اثر سے نہیں بچ سکے ہیں، اور ان کے بعد کے شعراء نے تو اس میں عجب عجب گُل کھلائے ہیں اور اس کو کچھ عجیب ہی شکل دے دی ہے۔ لکھنوی شعراء نے اس روایت میں جس پہلو کا اضافہ کیا وہ اصلاح زبان کی طرف توجہ تھی۔ وہ اس معاملے میں بہت سخت تھے۔ اسی لئے زبان ان کے یہاں دُھلی دُھلائی اور منجھی منجھائی نظر آتی ہے۔ الفاظ ان کے یہاں ہیرے کی طرح ترشے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ اُن کا لہجہ سانچے میں ڈھلا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ غالب نے زبان و بیان کے اس تہذیبی رُجحان سے یقیناً کسی نہ کسی حد تک اثر قبول کیا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ ناسخ کا نام عزت اور احترام سے نہ لیتے۔ اور ایک زمانے

ہیں ایسے اشعار نہ کہتے جن میں نمایاں طور پر ناسخ کے فن کی جھلک صاف نظر آتی ہے۔

غالب کا زمانہ شاہ نصیر، ذوق اور مومن کا زمانہ بھی تھا۔ شاہ نصیر اور ذوق سے وہ اثر توخیر قبول کیا کرتے۔ البتہ اتنا ضرور ہوا کہ زبان و بیان کی طرف جو توجہ ان لوگوں نے کی، اس نے بالواسطہ طور پر غالب کے فن کو کسی نہ کسی حد تک متاثر ضرور کیا۔ چنانچہ ان کے یہاں الفاظ کو بنانے، ترکیبوں کو تراشنے اور زبان کو سنوارنے کا جو رُجحان ملتا ہے اس میں کسی نہ کسی حد تک اس ماحول کا ہاتھ ضرور ہے جو شاہ نصیر، ذوق اور مومن کے اثر سے اس زمانے کی دِلّی میں پیدا ہو گیا تھا۔

یہ تو ماحول کے اثرات تھے جو مختلف زاویوں سے غالب کے فن پر اثر انداز ہوتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن آس پاس اور گرد و پیش کے ان خارجی اثرات کے ساتھ ساتھ غالب کے انفرادی حالات اور نجی معاملات نے بھی ان کے فن کی تشکیل و تعمیر میں نمایاں حصّہ لیا ہے۔

غالب کو اپنی خاندانی عظمت اور نسلی برتری کا شدید احساس تھا۔ وہ ایک ترک تھے۔ سو پُشت سے ان کے آباؤ اجداد کا پیشہ سپہ گری تھا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ شاعری کو اپنے لئے ذریعۂ عزّت نہیں سمجھتے تھے۔ غالب کو اپنے خاندان کی برتری کا جو احساس تھا وہ صحیح تھا یا غلط اور اس کے عوامل اور محرکات کیا تھے۔ یہ ایک الگ بحث ہے۔ اس وقت تو یہ دیکھنا مقصود

ہے کہ اس کے اثرات ان کے فن پر کیا ہوئے ؟ ان کے فن میں وہ جو ایک برتری کا احساس ملتا ہے اس کا منبع یہی ہے۔ غالب کے فن میں فنادگی نہیں ہے۔ وہ غزل میں بھی اپنے آپ کو پامال نہیں کرتے۔ خوب سے خوب تر کی تلاش فنّی اعتبار سے بھی ان کے یہاں جاری رہتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے یہاں گرمی اور روشنی دونوں کا احساس ہوتا ہے اور ساتھ ہی نفاست پسندی بھی نظر آتی ہے۔ نکھار بھی اپنے آپ کو نمایاں کرتا ہے۔ اور یہ سب ان کی نسلی خصوصیات ہیں جو ان کی شخصیت کے ساتھ ساتھ ان کے فن میں بھی اپنا جلوہ دکھاتی ہیں۔

مومن کی طرح غالب کی جوانی پوری طرح دیوانی نہیں تھی۔ ستم پیشہ ڈومنی سے عشق کرنا اور جس پر مرنا اس کو مار رکھنا، جس کا ذکر غالب نے اپنے خطوط میں جگہ جگہ کیا ہے، اس کی اہمیت ایسی کچھ زیادہ نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی چھاپ بھی ان کے فن میں ایسی کچھ زیادہ نمایاں نظر نہیں آتی۔ اس سے کہیں زیادہ اثر تو اس کھلنڈرے پن کا ان کے فن میں دکھائی دیتا ہے جو بچپن میں ان کے مزاج کا جز بن گیا تھا۔ غالب کے فن میں اس کے اثرات روایت شکنی، بے جا قیود سے گلو خلاصی، ایک طرح کے احساس آزادی اور کہیں کہیں سنجیدگی اور ثقاہت سے انحراف کی صورت میں ملتا ہے۔ غالب روایت کے پابند تھے لیکن اپنے فن میں انھوں نے عملی طور پر روایت کے بہت سے بتوں کو توڑا ہے۔ ان کے فن میں شروع سے آخر تک بے باکی سے بات کہنے اور کسی کی پروا نہ کرنے

کا جو رجحان ہے، اس کا منبع وہی احساسِ آزادی ہے جو بچپن میں بے راہ روی کی زندگی بسر کرنے کی وجہ سے ان کی شخصیت کا لازمی جزُ بن گیا تھا۔ ان کے فن میں جگہ جگہ احساسِ مزاح کا جو میلان ملتا ہے اور ظرافت کی جو بجلیاں سی کوندتی نظر آتی ہیں، اس کے پیچھے بھی ان کے بچپن کی زندگی کا وہ زمانہ ہے جب سنجیدگی اور ثقاہت کی طرف ان کی توجہ نسبتاً کم ہو گئی تھی۔

زندگی کا قانون ہے کہ رومانیت اور رومان پسندی ایسے لوگوں کا مُقدّر بن جاتی ہے۔ کیونکہ وہ زندگی کی ان منزلوں سے گذر کر خیالات کی دنیائیں بسا لیتے ہیں اور تخیّل کے سہارے جینے کا سامان کرتے ہیں۔ شاید اس وجہ سے کہ زندگی سے جو تقاضے وہ کرتے ہیں وہ پورے نہیں ہوتے۔ اس لئے وہ تخیّل کے سہارے ان کی طرف لپکتے ہیں اور پھر یہی ان کا شعار بن جاتا ہے۔ غالب کو بھی یہی صورتِ حال پیش آئی ہے۔ جس ڈھب سے انہوں نے زندگی کو بسر کیا ہے۔ اس نے ان کے مزاج میں رومانیت اور رومان پسندی پیدا کر دی ہے۔ چنانچہ اس کے اثرات ان کے فن میں بھی نمایاں ہوئے ہیں۔ ان کے یہاں جو بلند پروازی، بلند آہنگی، رنگینی اور رنگین کاری ہے وہ اسی رومانیت اور رومان پسندی کا نتیجہ ہے۔ اسی کے سہارے وہ اپنے فن میں بھی وادیٔ خیال کو اس طرح مستانہ طے کرتے ہیں کہ بازگشت کا مدعا تک ان کے یہاں باقی نہیں رہتا ؎

مستانہ طے کروں ہوں رہِ وادیٔ خیال
تا بازگشت سے نہ رہے مدعا مجھے

رومانی فن کار تخیل کے رنگوں سے حسین دُنیائیں بناتا ہے اور اسے اپنی مثالیت پسندی سے سجاتا ہے۔ لیکن اس کی یہ مثالیت پسندی اسے ایسے چرکے بھی لگاتی ہے کہ وہ ذہنی طور پر لہو لہان ہو کر زندگی سے بیزار ہونے لگتا ہے اور اس زندگی کی ہر چیز اسے بے اساس نظر آنے لگتی ہے۔ اس صورتِ حال کا ردِ عمل اس کے یہاں غم پسندی کی صورت میں نمایاں ہوتا ہے اور اس کے نتیجے میں اس کے فن میں ایک کسک کی سی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ اپنا غم، انسان اور انسانیت کا غم، زمانے کا غم، سب مل کر اس کے فن میں ایک گداز کی کیفیت کو اُبھارتے ہیں۔ غالب کے فن میں بھی گداز کا یہ رنگ باوجود اپنے نشاطیہ آہنگ کے خاصا گہرا نظر آتا ہے۔

ایک ایسا فن کار جو اس منزل پر پہنچ جائے، اس کے یہاں فکری عنصر کا نمایاں ہونا لازمی ہے۔ اس فکری عنصر سے اس کے یہاں سنجیدگی، گہرائی اور گیرائی پیدا ہوتی ہے۔ غالب کے یہاں بھی یہ فکری عنصر نمایاں ہوا ہے اور اس کے نتیجے میں ان کے فن میں بھی سنجیدگی اور گہرائی کے وہ عناصر رونما ہوتے ہیں جن کے بارے میں شاید یہ کہنا بے جا نہیں کہ وہ ان کے فن کا سب سے بڑا سرمایہ ہیں۔ غالب فکری پہلوؤں کے اظہار و بلاغ میں نہ جانے کہاں کہاں پہنچتے ہیں اور نہ جانے کتنے نئے آسمانوں پر پرواز کرتے

ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اُن کے ہاتھوں ان گنت نئے پیکروں کی تخلیق ہوتی ہے۔ ان گنت نئی علامتیں وجود میں آتی ہیں۔ ایک لطیف سا ابہام صورت اختیار کرتا ہے اور ایک نہایت ہی حسین رمزیت اور ایمائیت اپنا جلوہ دکھاتی ہے۔ کیونکہ اس کے بغیر فکری پہلوؤں کی وسعتوں کا ایک ایسی صنف میں سمانا جس کا ظرف محدود ہو ناممکن اور محال ہے۔

غالب نے فارسی شاعری کی روایت کے سائے میں آنکھ کھولی اور اسی روایت کے سائے میں اُن کا ذہنی نشوونما ہوا۔ یہی وجہ ہے کہ فارسی کے اہم شاعروں کے اثرات اُن کے فن پر بڑے گہرے نظر آتے ہیں۔ مثلاً بیدلؔ، عرفیؔ، ظہوریؔ، نظیریؔ وغیرہ کے اثرات کی چھاپ ان کے فن میں جگہ جگہ نمایاں نظر آتی ہے۔ بیدل کی مشکل پسندی اور گہرائی، عرفی کی بلند خیالی اور رنگینی، نظیری کی پُرکاری، ظہوری کی دردی کے بے شمار رنگوں نے مل کر غالب کے فن کو ایک اچھی خاصی قوس قزح بنا دیا ہے۔

غرض یہ تہذیبی، معاشرتی، ذہنی اور فکری عوامل اور محرکات تھے جن کے ہاتھوں غالب کے فن کی عمارت تعمیر ہوئی اور جس میں ان تمام پہلوؤں کے اثرات نے اپنے حسین امتزاج سے کچھ ایسی شان و شکوہ کی کیفیت پیدا کر دی ہے جو عام حالات میں ذرا مشکل ہی سے پیدا ہوتی ہے۔

غالب اس اعتبار سے، جہاں تک ان کی فن کاری کا تعلق ہے، ایک منفرد حیثیت رکھتے ہیں۔

موضوع اور فن کی ہم آہنگی

جیسا کہ اس سے قبل بھی اشارہ کیا جا چکا ہے غالب کا اظہار و ابلاغ اپنے موضوع اور مواد کے ساتھ پوری طرح ہم آہنگ ہے۔ اُن کا فن خیال کا اور خیال فن کا پابند ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان دونوں کو ایک دوسرے سے علیحدہ کرکے نہیں دیکھا جا سکتا۔ ہم ان کو خانوں میں نہیں بانٹ سکتے۔ غالب نے تو ان دونوں میں ایسی مناسبت اور ہم آہنگی پیدا کی ہے کہ وہ آپس میں پوری طرح شیر و شکر معلوم ہوتے ہیں۔

غالب کی شاعری میں موضوعات کا بڑا تنوّع ہے۔ خیال کی بڑی وسعتیں ہیں۔ وہ مواد کے اعتبار سے بڑی ہمہ گیر شاعری ہے۔ زندگی اس پر حاوی ہے اور وہ خود زندگی پر حاوی ہے۔ اس میں حُسن ہے، حُسن پرستی ہے، عشق ہے، عاشقی ہے، انسان ہے، انسانیت

ہے، انسان دوستی ہے، انسانیت پرستی ہے، سیاست ہے، معاشرت ہے، تہذیب ہے، ثقافت ہے۔ غرض اس میں کم و بیش وہ ہر چیز ہے جو زندگی میں ہے یا ہو سکتی ہے اور اگر نہیں ہو سکتی تو پھر اس کی جگہ کیا ہو سکتا ہے یا کیا ہونا چاہیئے۔ غالب نے ان سب کی تفسیر کی ہے اور ان کے مختلف پہلوؤں کی تفصیل پیش کی ہے۔ اور اس طرح اپنے متنوّع تجربات کو ظاہر کیا ہے کہ خود ان کے فن میں بھی تنوع کی خصوصیّت پیدا ہو گئی ہے۔ چنانچہ ان کے یہاں یکسانی اور یک رنگی نہیں ملتی۔ برخلاف اس کے ایک رنگا رنگی کا احساس ہوتا ہے۔

حسن اور حسن پرستی غالب کی شاعری کا ایک اہم موضوع ہے۔ انہوں نے اس حسن اور حسن پرستی کو انسانی زندگی میں بڑی اہمیّت دی ہے۔ ان کے یہاں اس کا ایک مکمل نظام ملتا ہے۔ انہوں نے اس کا رشتہ عشق و عاشقی سے بھی جوڑا ہے اور انسانی زندگی کے اس اہم پہلو کی بھی حقیقت سے بڑی بھرپور ترجمانی کی ہے۔ ان کی شاعری میں ان موضوعات کا پلّہ اچھّا خاصا بھاری ہے۔ بقول حمید احمد خان :-

"غالب کے اُردو اور فارسی کلام میں حسن و عشق کو ایک نمایاں جگہ حاصل ہے۔ تعداد کے لحاظ سے پُورے کلام میں اس مضمون کے اشعار آدھے نہیں مگر ایک تہائی کے قریب ضرور ہوں گے۔ ان اشعار میں وہی تنوّع جدّت طرازی اور نکتہ آفرینی نظر آتی ہے جو دیوان اور کُلیات کے دوسرے مضامین کا امتیازِ خاص ہے۔ اگر

مرزا غالب اپنے کلام کا صرف یہی ایک عنصر چھوڑ جاتے تو بھی ان کا شمار دنیا کے بڑے شاعروں میں ہوتا۔ ان اشعار میں محض رنگارنگ طلسمات کے بند دروازے ہی نہیں کھلتے۔ ان میں شاعری کی ایک نئی دنیا کا انکشاف ہے۔ اس دنیا کی آب و ہوا ہر طبیعت کو سازگار نہیں ہے اور نہ ہو سکتی ہے لیکن اس کی وسعت اور بوقلمونی کا یہ عالم ہے کہ ہر موقع کی مناسبت سے دلکشا مناظر بہ کثرت ملتے ہیں۔ انسانی فطرت کے نامحدود پہلو جذبۂ عشق کے ماتحت جس جس طرح سنورتے، بگڑتے، پگھلتے اور ڈھلتے ہیں، اس کی ترجمانی میں شاعر نے اپنا تمام جوشِ تخیّل اور پورا زورِ قلم صرف کیا ہے۔"
(غالب کی شاعری میں حسن و عشق ۔ نقدِ غالب)

غالب کی شاعری میں حسنؔ کا بیان صرف خارجی زاویۂ نظر ہی سے نہیں ہوا ہے۔ اس میں تو مشاہدہ اور محسوسات دونوں کے اثرات نظر آتے ہیں اور پھر ان کا فکر و شعور بھی اس میں شامل ہو جاتا ہے۔ چنانچہ ان کے فن میں ایسی منزلیں بھی آتی ہیں جب حسن کے بیان میں حقائق کی تلاش و جستجو شروع ہو جاتی ہے۔ یہاں پہنچ کر حسنؔ صرف حسنِ انسانی تک محدود نہیں رہتا۔ کائنات کا حسن بھی انہیں اپنی طرف متوجہ کرتا ہے۔ چنانچہ وہ مظاہرِ فطرت کو حیرت سے دیکھتے ہیں اور اس طرح فلسفیانہ تحلیل کے لئے اپنے آپ کو آمادہ کرتے ہیں۔ اور ان کی فکر عشقِ حقیقی تک رسائی حاصل کر کے ایک فلسفیانہ

انداز و اسلوب کو ان کے فن میں نمایاں کر دیتی ہے لیکن یہاں بھی ان کے اظہار و ابلاغ کی طرح داری اور بانکپن کو ٹھیس نہیں لگتی۔ غرض حسن کے مختلف اور متنوع پہلوؤں کے بیان میں بھی غالب نے اگرچہ اسلوب کے تنوع اور رنگا رنگی کو باقی رکھا ہے۔ لیکن اس میں ہر جگہ ان کی جمال آفرینی اپنے شباب پر نظر آتی ہے۔ حسن، حسن پرستی یا محبوب کے حسن اور حسن عمل کے موضوعات پر یہ اشعار ان کی اس جمال آفرینی کے بہترین نمونے ہیں ؎

رنگِ شکستہ صبحِ بہارِ نظارہ ہے
یہ وقت ہے شگفتنِ گل ہائے ناز کا

منہ نہ کھلنے پر ہے وہ عالم کہ دیکھا ہی نہیں
زلف سے بڑھ کر نقاب اس شوخ کے منہ پر کھلا

کوئی میرے دل سے پوچھے ترے تیرِ نیم کش کو
یہ خلش کہاں سے ہوتی جو جگر کے پار ہوتا

بجلی اک کوند گئی آنکھوں کے آگے تو کیا
بات کرتے کہ میں لب تشنۂ تقریر بھی تھا

جب تک کہ نہ دیکھا تھا قدِ یار کا عالم
میں معتقدِ فتنۂ محشر نہ ہوا تھا

آئینہ دیکھ اپنا سا منہ لے کے رہ گئے
صاحب کو دل نہ دینے پہ کتنا غرور تھا

ذکر اُس پری وش کا اور پھر بیاں اپنا
بن گیا رقیب آخر تھا جو راز داں اپنا

مرتا ہوں اس آواز پہ ہر چند سر اُڑ جائے
جلاد کو لیکن وہ کہے جائیں کہ "ہاں اور"

تو اور آرائشِ خمِ کاکُل
میں اور اندیشہ ہائے دور و دراز

جہاں تیرا نقشِ قدم دیکھتے ہیں
خیاباں خیاباں اِرم دیکھتے ہیں

ترے سروِ قامت سے اک قدِ آدم
قیامت کے فتنے کو کم دیکھتے ہیں

ہے تیوری چڑھی ہوئی اندر نقاب کے
ہے اک شکن پڑی ہوئی طرفِ نقاب میں

لاکھوں لگاؤ ایک چرانا نگاہ کا
لاکھوں بناؤ ایک بگڑنا عتاب میں

شرم اک ادائے ناز ہے اپنے ہی سے سہی
ہیں کتنے بے حجاب کہ ہیں یوں حجاب میں

آرائشِ جمال سے فارغ نہیں ہنوز
پیشِ نظر ہے آئینہ دائم نقاب میں

نظر لگے نہ کہیں اس کے دست و بازو کو
یہ لوگ کیوں مرے زخمِ جگر کو دیکھتے ہیں

اس سادگی پہ کون نہ مر جائے اے خدا
لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں

یہ کس بہشت شمائل کی آمد آمد ہے
کہ غیرِ جلوۂ گُل رہ گذر میں خاک نہیں

جب وہ جمالِ دل فروز صورتِ مہرِ نیم روز
آپ ہی ہو نظارہ سوز پردے میں منہ چھپائے کیوں

دشنۂ غمزۂ جاں ستاں ناوکِ نازِ بے پناہ
تیرا ہی عکسِ رُخ سہی سامنے تیرے آئے کیوں

پرسشِ طرزِ دلبری کیجئے کیا کہ بن کہے
اس کے ہر اک اشارے سے نکلے ہے یہ ادا کہ یوں

غنچۂ ناشگفتہ کو دور سے مت دکھا کہ یوں
بوسے کو پوچھتا ہوں میں مُنہ سے مجھے بتا کہ یوں

اُلجھتے ہو تم اگر دیکھتے ہو آئینہ
جو تم سے شہر میں ہوں ایک دو تو کیوں کر ہو

چشمِ خوباں خامشی میں بھی نوا پرداز ہے
سرمہ تو کہوے کہ دودِ شعلۂ آواز ہے

ہو کے عاشق وہ پری رو اور نازک بن گیا
رنگ کھلتا جائے ہے جتنا کہ اُڑتا جائے ہے

نقش کو اس کے مصوّر پر بھی کیا کیا ناز ہیں
کھینچتا ہے جس قدر اتنا ہی کھنچتا جائے ہے

سادگی پر اُس کے مَر جانے کی حسرت دِل میں ہے
بس نہیں چلتا کہ پھر خنجر کفِ قاتل میں ہے

نظّارے نے بھی کام کیا واں نقاب کا
مُستی سے ہر نگہ ترے رُخ پر بکھر گئی

دیکھو تو دلفریبیٔ اندازِ نقشِ پا
موجِ خرامِ یار بھی کیا گُل کتر گئی

دل ہوائے خرامِ ناز سے پھر
محشرستانِ بے قراری ہے

نہ شعلے میں یہ کرشمہ نہ برق میں یہ ادا
کوئی بتاؤ کہ وہ شوخِ تند خُو کیا ہے

چپک رہا ہے بدن پر لہو سے پیراہن
ہماری جیب کو اب حاجتِ رفو کیا ہے

قہر ہو یا بَلا ہو جو کچھ ہو
کاش کہ تم میرے لئے ہوتے

عارضِ گُل دیکھ روئے یار یاد آیا اسدؔ
جوششِ فصلِ بہاری اشتیاق انگیز ہے

مُنہ نہ دکھلاوے نہ دکھلا، پر بہ اندازِ عتاب
کھول کر پردہ ذرا آنکھیں ہی دکھلا دے مجھے

وہ نیشتر سہی پر دِل میں جب اُتر جاوے
نگاہِ ناز کو پھر کیوں نہ آشنا کہیے

نہیں نگار کو اُلفت نہ ہو نگار تو ہے
روانیٔ روش و مستیٔ ادا کہیے!

نہیں بہار کو فرصت نہ ہو بہار تو ہے
طراوتِ چمن و خوبیٔ ہوا کہیے!

چاہے ہے پھر کسی کو مقابل میں آرزو
سرمے سے تیز دشنۂ مژگاں کیے ہوئے

اک نو بہارِ ناز کو تاکے ہے پھر نگاہ
چہرہ فروغِ مے سے گلستاں کیے ہوئے

مانگے ہے پھر کسی کو لبِ بام پر ہوس
زلفِ سیاہ رُخ پہ پریشاں کئے ہوئے

یہ پری چہرہ لوگ کیسے ہیں
غمزہ و عشوہ و ادا کیا ہے

شکنِ زلفِ عنبریں کیوں ہے
نگہِ چشمِ سرمہ سا کیا ہے

یہ طویل انتخاب یہاں جان کر پیش کیا گیا ہے۔ اس کا مقصد صرف یہ ہے کہ حسن کے مختلف پہلوؤں کو پیش کرنے کے لئے جو زاویے غالب نے ان اشعار میں تلاش کئے ہیں، اس کی پوری طرح وضاحت ہو اور ان سے صحیح طور پر آشنا ہونے کا موقع ملے۔ ان اشعار کی بنیاد صرف مشاہدہ نہیں ہے بلکہ محسوسات ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان میں خارجیت کا رنگ نظر نہیں آتا۔ برخلاف اس کے داخلیت کا رنگ ان میں خاصا گہرا نظر آتا ہے۔ یہ حسن سے زیادہ حسن کے ردِّ عمل سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ حواس کے ارتعاش کی پیداوار ہیں۔ اس لئے حواس میں ارتعاش پیدا بھی کرتے ہیں۔ ان کی جڑیں احساس اور جذبے کی زمین میں بڑی گہری ہیں۔ اس لئے ان میں سے ہر ایک ایک ہمہ گیر تجربہ معلوم ہوتا ہے۔ ان میں بیانیہ انداز نہیں ہے۔ بلکہ پہلودار طرزِ اظہار ہے۔ اور اسی پہلودار طرزِ اظہار میں اس

جمال آفرینی کا راز ہے جو غالب کا طرۂ امتیاز ہے۔

ان اشعار کے موضوعات مختلف اور متنوع ہیں۔ لیکن ان کا محور حسن ہے اور وہ اسی حسن کے گرد گھومتے ہیں۔ غالب نے ان اشعار میں حسن کے جن پہلوؤں کا یا جن پہلوؤں کے حسن کا ذکر کیا ہے وہ بھی نئے ہیں اور جس انداز میں ان کا ذکر کیا ہے ان میں بھی ایک نیا پن ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان اشعار میں سے ہر ایک میں جدت ادا کی خصوصیت کسی نہ کسی زاویے سے اپنا جلوہ ضرور دکھاتی ہے اور ان کے حسن و جمال کا راز اس جدتِ ادا میں بھی ہے۔ پھر ایک بات یہ بھی کہ حسن کے بیان میں بعض مقامات ایسے بھی آتے ہیں جب غالب کا ذوقِ جمال احساسِ مزاح کے ساتھ مل کر ان اشعار میں مجموعی طور پر ایک نہایت ہی حسین فضا قائم کر دیتا ہے اور یہ فضا غالب کے فن کی جان ہے۔ اس کے علاوہ غالب کے فکری میلان اور فلسفیانہ رجحان نے حیرت کی جو فضا ان میں سے بعض اشعار میں پیدا کر دی ہے وہ بھی احساسِ جمال کی تسکین کا باعث بنتی ہے۔ غرض حسن اور حسن پرستی کے موضوع نے غالب کے فن میں بڑے پہلو پیدا کئے ہیں اور جمالیاتی اعتبار سے اس کو حد درجہ دلآویز اور دل نشین بنا دیا ہے۔

غالب نے حسن اور حسن پرستی کے موضوع پر جن اشعار کی تخلیق کی ہے، ان سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ وہ حسن کے بارے میں محض سطحی باتوں کی ترجمانی نہیں کرتے۔ بلکہ انسان کی ذہنی اور جذباتی کیفیت، اس کے جسمانی تقاضوں، اس کی خواہشوں اور آرزوؤں اور اس کے فکر و شعور کے مختلف پہلوؤں کو پیش کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ غالب کے یہاں

حسن کا بیان، انسانی نفسیات اور انسان اور انسانی زندگی کے درمیان باہمی رشتوں اور روابط کا بیان بن جاتا ہے۔ اس سلسلے میں وہ بعض ایسے معاملات و مسائل کی ترجمانی کرتے ہیں جن میں بہ ذاتِ خود بھی حسن ہوتا ہے لیکن غالب اس سلسلے میں حالات و واقعات کی جو صورتیں پیدا کرتے ہیں، وہ ان کو کچھ زیادہ ہی حسین بنا دیتی ہیں۔

یہ صورتِ حال یوں تو ان کے ایسے اشعار میں بھی نمایاں ہے جن کا موضوع حسن اور حسن پرستی ہے لیکن اس کی بہترین مثالیں ان اشعار میں نسبتاً زیادہ ملتی ہیں جن میں حسن سے زیادہ عشق و عاشقی کے مختلف اور متنوع پہلوؤں کا بیان ہے۔ عشق و عاشقی کے بیان میں غالب نے پوری زندگی کو اپنے دائرے میں سمیٹ لیا ہے۔ یہی سبب ہے کہ ان کی عشقیہ شاعری میں جن مضامین کا بیان ملتا ہے، ان میں بڑا تنوع ہے۔ وہ کہیں عشق و عاشقی کے ہلکے پھلکے پہلوؤں کی ترجمانی کرتے ہیں۔ کہیں ظرافت اور مزاح کے پیرائے میں اس جذبے کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالتے ہیں۔ کہیں انتہائی سنجیدگی کے ساتھ اس جذبے کی واردات و کیفیات کو پیش کرتے ہیں۔ کہیں حد درجہ رنگینی اور رعنائی کے ساتھ اس کے مختلف معاملات کی تصویریں بناتے ہیں۔ کہیں حد درجہ گہرائی کے ساتھ اس کے پیچیدہ مسائل کو سلجھاتے ہیں۔ کہیں نہایت بے باکی کے ساتھ اس جذبے کے بعض حقائق کو بیان کرتے ہیں اور کہیں بڑی ہمہ گیری کے ساتھ اس جذبے کی ماہیت کا سراغ لگاتے ہیں اور اس کی فلسفیانہ تحلیل کرتے ہیں۔ غالب کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے ان تمام مختلف بلکہ متضاد پہلوؤں کی ترجمانی میں جمالیاتی اظہار کی نئی نئی

صورتیں پیدا کی ہیں۔
مثال کے طور پر عشق و عاشقی کے موضوع پر غالب کی شاعری میں اس قسم کے اشعار بھی ملتے ہیں ؂

بلبل کے کاروبار پہ ہیں خندہ ہائے گل
کہتے ہیں جس کو عشق خلل ہے دماغ کا

اس سادگی پہ کون نہ مر جائے اے خدا
لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں

آنکھ کی تصویر سرنامے پہ کھینچی ہے کہ تا
تجھ پہ کھل جاوے کہ اس کو حسرتِ دیدار ہے

چھوڑی اسدؔ نہ ہم نے گدائی میں دل لگی
سائل ہوئے تو عاشقِ اہلِ کرم ہوئے

کہتے ہو نہ دیں گے دل ہم نے گر پڑا پایا
دل کہاں کہ گم کیجئے ہم نے مدعا پایا

غافل اِن مہ طلعتوں کے واسطے
چاہنے والا بھی اچھا چاہئے

چاہتے ہیں خوبرویوں کو اسدؔ
آپ کی صورت تو دیکھا چاہیے

سادہ و پُرکار ہیں خوباں غالبؔ
ہم سے پیمانِ وفا باندھتے ہیں

بوسہ دیتے نہیں اور دِل پہ ہے ہر لحظہ نگاہ
جی میں کہتے ہیں کہ مفت ہاتھ آئے تو مال اچھا ہے

مگر لکھوائے کوئی اس کو خط تو ہم سے لکھوائے
ہوئی صبح اور گھر سے کان پر رکھ کر قلم نکلے

در پہ رہنے کو کہا اور کہہ کے کیا پھر گیا
جتنے عرصے میں مرا لپٹا ہوا بستر کھُلا

دل ہی تو ہے سیاستِ درباں سے ڈر گیا
میں اور جاؤں دَر سے ترے بِن صدا کئے

دے وہ جس قدر ذلت ہم ہنسی میں ٹالیں گے
بارے آشنا نکلا ان کا پاسباں اپنا

گدا سمجھ کے وہ چپ تھا مری جو شامت آئی
اُٹھا اور اُٹھ کے قدم میں نے پاسباں کے لئے

میں نے کہا کہ بزمِ ناز چاہئے غیر سے تہی
سُن کے ستم ظریف نے مجھ کو اُٹھا دیا کہ یوں

ہے کیا جو کس کے باندھیے میری بلا ڈرے
کیا جانتا نہیں ہوں تمہاری کمر کو میں

ان اشعار میں شوخی کا حُسن ہے۔ ظرافت کا جمال ہے۔ غالب اس انداز سے حسن و جمال کو پیدا کرنے میں اپنا ثانی نہیں رکھتے۔ اُردو غزل کی روایت میں صرف شیخ اور واعظ کے ذکر کے ساتھ شوخی اور ظرافت کا حسن و جمال پیدا ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ کسی اور موضوع میں حُسن کی یہ قدر نمایاں نہیں ہوتی۔ لیکن غالب کا کمال یہ ہے کہ عشق و عاشقی اور کاروبارِ شوق کے مختلف پہلوؤں کی ترجمانی میں انہوں نے بعض ایسی صورتیں پیدا کی ہیں جن کے بیان میں حسن و جمال کا یہ انداز پیدا ہو گیا ہے۔ عشق کو دماغ کا خلل کہنا، محبوب کا بغیر تلوار کے لڑنا اور عاشق کا سادگی پر مرنا، حسرتِ دیدار کو ظاہر کرنے کے لئے آنکھ کی تصویر سرنامے پر کھینچنا، گدائی میں دل لگی کو نہ چھوڑنا، دل کا محبوب سے واپس نہ ملنا۔ مرطلعتوں کے لئے اچھی صورت کا عاشق ہونا، صبح کو گھر سے کان پر رکھ کر قلم نکلنا، سیاستِ دربان سے ڈرنا، عاشق کا پاسبان کے قدم لینا، محبوب کا

عاشق کو غیر سمجھ کر اٹھا دینا ــــ یہ تمام مضامین اُردو غزل کی روایت میں نئے ہیں۔ اسی لئے غالب نے ان کو پیش کرنے میں بھی ایک نیا اندازِ بیان اختیار کیا ہے۔ ان مضامین میں شوخی ہے۔ ان کی بنیاد احساسِ مزاح ہے۔ یہی وجہ ہے کہ غالب نے ان کے جمالیاتی اظہار میں ظرافت سے کام لیا ہے اور اس طرح وہ فنی اعتبار سے حسن کاری کے ایک ایسے انداز کو پیدا کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں جو صرف انہیں کے فن کا حصہ ہے۔

عشق و عاشقی کے بیان میں نشاطیہ رنگ اور طربیہ آہنگ بھی غالب کی شاعری میں بہت نمایاں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ عشق کو غالب نے انسان کا ایک بنیادی جذبہ اور دو انسانوں کے درمیان ایک بنیادی رشتہ قرار دیا ہے۔ اس رشتے میں بعض ایسی منزلیں بھی آتی ہیں، جب انسان کی آنکھوں کے سامنے رنگین پردے سے پڑ جاتے ہیں اور وہ اس زندگی کے ہر پہلو اور کائنات کی ہر چیز کو رنگین اور پرکار، شگفتہ اور شاداب دیکھتا ہے۔ یہ انسانی زندگی کے حسین ترین لمحے ہوتے ہیں۔ ان لمحوں میں رنگ بکھرتے ہیں اور زندگی رنگینی اور رعنائی سے بھرپور ہو جاتی ہے۔ غالب کی شاعری میں اس کیفیت کی ترجمانی بہت زیادہ ہے۔ اور اس کیفیت کی ترجمانی میں انہوں نے جو اندازِ بیان اختیار کیا ہے وہ اپنے موضوع کے ساتھ پوری طرح ہم آہنگ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس اندازِ بیان میں بھی رنگینی اور رعنائی کا شباب نظر آتا ہے اور شگفتگی اور شادابی اپنے معراجِ کمال پر دکھائی دیتی ہے۔

یہ اشعار نہ صرف موضوع بلکہ اسلوب اور اندازِ بیان کے لحاظ

سے بھی کتنے رنگین اور کس درجہ شگفتہ اور شاداب ہیں ۔

تجاہل پیشگی سے مدعا کیا
کہاں تک اے سراپا ناز کیا کیا

نوازش ہائے بے جا دیکھتا ہوں
شکایت ہائے رنگیں کا گلا کیا

نگاہِ بے محابا چاہتا ہوں
تغافل ہائے تمکیں آزما کیا

ے تو لوں سوتے میں اس کے پاؤں کا بوسہ مگر
ایسی باتوں سے وہ کافر بدگماں ہو جائے گا

ہم تھے مَرنے کو کھڑے پاس نہ آیا نہ سہی
آخر اس شوخ کے ترکش میں کوئی تیر بھی تھا

ذِکر اس پری وش کا اور پھر بیاں اپنا
بن گیا رقیب آخر تھا جو رازداں اپنا

ے وہ کیوں بہت پیتے بزمِ غیر میں یارب
آج ہی ہُوا منظور ان کو امتحاں اپنا

چھپکے چھپکے مجھ کو روتے دیکھ پاتا ہے اگر
ہنس کے کرتا ہے بیانِ شوخیٔ گفتار دوست

تو اور آرائشِ خمِ کاکل
میں اور اندیشہ ہائے دور و دراز

دَھول دَھپّا اس سراپا ناز کا شیوہ نہیں
ہم ہی کر بیٹھے تھے غالبؔ پیش دستی ایک دن

ہم سے کھُل جاؤ بہ وقتِ مے پرستی ایک دن
ورنہ ہم چھیڑیں گے رکھ کر عُذرِ مستی ایک دن

ہم پر جفا سے ترکِ وفا کا گماں نہیں
اک چھیڑ ہے وگرنہ مراد امتحاں نہیں

کس مُنہ سے شُکر کیجئے اس لطفِ خاص کا
پرسش ہے اور پائے سخن درمیاں نہیں

بوسہ نہیں نہ دیجئے دُشنام ہی سہی
آخر دہاں تو رکھتے ہو تم گر زباں نہیں

جان ہے بہائے بوسہ ولے کیوں کہے ابھی
غالب کو جانتا ہے کہ وہ نیم جان نہیں

تماشا کر اے محوِ آئینہ داری
تجھے کس تمنا سے ہم دیکھتے ہیں!

دشنۂ غمزہ جاں ستاں ناوکِ ناز بے پناہ
تیرا ہی عکسِ رُخ سہی سامنے تیرے آئے کیوں

غنچۂ ناشگفتہ کو دُور سے مت دکھا کہ یوُں!
بوسے کو پوچھتا ہوں میں مُنہ سے مجھے بتا کہ یوُں

پُرسشِ طرزِ دلبری کیجئے کیا کہ بن کہے
اُس کے ہر اک اشارے سے نکلے ہے یہ ادا کہ یوُں

رات کے وقت مے پئے ساتھ رقیب کو لئے
آئے وہ یاں خدا کرے پر نہ خدا کرے کہ یوُں

غیر سے رات کیا بنی" یہ جو کہا تو دیکھئے
سامنے آن بیٹھنا، اور یہ دیکھنا، کہ یوُں

بزم میں اس کے روبرو کیوں نہ خموش بیٹھئے
اس کی تو خامشی میں بھی ہے یہی مدعا کہ یوں

مجھ سے کہا جو یار نے جاتے ہیں ہوش کس طرح
دیکھ کے میری بے خودی چلنے لگی ہوا کہ یوں

کب مجھے کوئے یار میں رہنے کی وضع یاد تھی
آئینہ دار بن گئی حیرتِ نقشِ پا کہ یوں

گر ترے دل میں ہو خیال وصل میں شوق کا زوال
موجِ محیط آب میں مارے ہے دست و پا کہ یوں

وفا کیسی کہاں کا عشق جب سر پھوڑنا ٹھہرا
تو پھر اے سنگدل تیرا ہی سنگِ آستاں کیوں ہو

یار سے چھیڑ چلی جائے اسدؔ
گر نہیں وصل تو حسرت ہی سہی

اس بزم میں مجھے نہیں بنتی حیا کیے
بیٹھا رہا اگرچہ اشارے ہوا کیے

سادگی پر اُس کی مَر جانے کی حسرت دل میں ہے
بس نہیں چلتا کہ پھر خنجر کفِ قاتل میں ہے

پھر کچھ اک دل کو بیقراری ہے
سینہ جویائے زخمِ کاری ہے

پھر جگر کھودنے لگا ناخُن
آمدِ فصلِ لالہ کاری ہے!

دل ہَوائے خرامِ ناز سے پھر
محشرستانِ بے قراری ہے

مے نے کیا ہے حُسنِ خود آرا کو بے حجاب
اے شوق یاں اجازتِ تسلیم و ہوش ہے

کبھی نیکی بھی اُس کے جی میں گر آجائے ہے مجھ سے
جفائیں کرکے اپنی یاد شرما جائے ہے مجھ سے

وہ بد خو اور میری داستانِ عشق طولانی
عبارت مختصر قاصد بھی گھبرا جائے ہے مجُھ سے

ادھر وہ بدگمانی ہے اُدھر وہ ناتوانی ہے
نہ پوچھا جاتے ہے مجھ سے نہ بولا جائے ہے مجھ سے

اِن اشعار میں انسان کی لطیف ترین کیفیات کا بیان رنگین ترین پیرائے میں ہوا ہے۔ غالب نے اِن میں نوازش ہائے بے جا، شکایت ہائے رنگین، نگاہِ بے محابا، تغافل ہائے تمکین آزما، شوخیٔ گفتارِ دوست، آرائشِ خمِ کاکل، اندیشہ ہائے دور و دراز، عذرِ مستی، لطفِ خاص بہائے بوسہ، محوِ آئینہ داری، دشنۂ غمزہ، ناوکِ ناز، غنچۂ ناشگفتہ، پرسشِ طرزِ دلبری، حیرتِ نقشِ پا، آمد فصلِ لالہ کاری، محشرستانِ بیقراری، اجازتِ تسلیم و ہوش، حسنِ خود آرا کی بے حجابی کی حسین اور پُرکار ترکیبوں میں کاروبارِ شوق کی جن منزلوں کی تصویریں کھینچی ہیں وہ بلاشبہ بہ ذاتِ خود بھی حسین اور دلآویز ہیں لیکن غالب کے اظہار و ابلاغ کی رنگینی اور پُرکاری نے ان کو کچھ اور بھی رنگین اور پُرکار بنا دیا ہے لیکن ان میں صرف الفاظ اور ترکیبوں کا حُسن ہی نہیں ہے جو غالب کے اس قسم کے اشعار کو جمالیاتی اقدار سے مالا مال کرتا ہے۔ بلکہ مجموعی طور پر جمالیاتی اظہار کی وہ فضا ہے جو غالب کے ایسے رچے ہوئے مذاق کے شاعر ہی کی شاعری میں پیدا ہوسکتی ہے۔ ان اشعار میں سے بیشتر میں کاروبار شوق کے مختلف معاملات کی ترجمانی ہے لیکن جہاں تک اظہار کا تعلق ہے کسی ایک شعر میں بھی وہ فضا پیدا نہیں ہوتی جو معاملہ بند شاعروں کی شاعری میں عام طور پر نظر آتی ہے۔ غالب کے مذاق میں اتنی تہذیب اور شائستگی ہے کہ وہ کاروبارِ شوق کے

ان لمحوں کی ترجمانی میں بھی اپنے حدود سے باہر نہیں نکلتے بلکہ جیسا کہ ان اشعار سے ظاہر ہے، وہ ان لمحات کی ترجمانی میں کچھ زیادہ ہی لطافت اور نفاست کا اہتمام کرتے ہیں۔لیکن یہ اہتمام شعوری نہیں ہوتا۔ یہ تو ان کا مزاج ہے چنانچہ اس مہذّب اور لطافت پسند مزاج ہی کا یہ نتیجہ ہے کہ وہ ان معاملات کی ترجمانی میں جمالیاتی اظہار کی لطافت اور نفاست کو باقی رکھتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ ان کے اس قسم کے اشعار میں یہ جمالیاتی اظہار اپنی انتہائی بلندیوں پر نظر آتا ہے۔

اس میں شبہ نہیں کہ جمالیاتی اظہار کا یہ انداز غالب کی شاعری اور خاص طور پر ان کے فن کا بہت بڑا سرمایہ ہے۔کیونکہ اس سے نہ صرف ان کی شاعری میں بلکہ اردو شاعری کی روایت میں ایک رنگینی اور شادابی نظر آتی ہے اور اس کے اثرات، غالب کے بعد آنیوالے شاعروں کے یہاں بھی کسی نہ کسی صورت میں ضرور ملتے ہیں۔ لیکن غالب کا اس سے بھی بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے اس رنگین اور پُرکار، شگفتہ و شاداب جمالیاتی اظہار کے ساتھ ساتھ جمالیاتی اظہار کا وہ انداز بھی پیدا کیا ہے جس کو دل پر لگی ہوئی چوٹ ہی پیدا کر سکتی ہے۔ اس جمالیاتی اظہار کی بنیاد ایک قسم کا گداز ہے جو احساسِ محرومی کے ہاتھوں پیدا ہوتا ہے۔اس کی اساس ایک قسم کی کسک ہے جو حسرت، ناکامی، نااُمیدی، بے اختیاری اور مجبوری کے ہاتھوں وجود میں آتی ہے۔ غالب کی شخصیت میں احساسِ نشاط اور احساسِ طرب کے ساتھ احساسِ محرومی و ناکامی بھی ملا ہوا تھا اور اس احساسِ محرومی و ناکامی نے ان کے یہاں کچھ زیادہ ہی شدّت اختیار کر لی تھی۔ سبب اس کا یہ ہے

کہ غالب طبیعت اور مزاج کے اعتبار سے رومانی تھے۔ رومانی کے یہاں یہ دونوں احساسات شدید ہوتے ہیں کیونکہ احساس نشاط کی شدت اس کے یہاں احساس محرومی کو شدید سے شدید تر کرتی رہتی ہے۔ اسی لئے رومانی مزاج شخص عیش و نشاط سے بھی مطمئن نہیں ہوتا۔ کیونکہ اس کے احساس کی شدت اور تخیل کی بلند پروازی اس کو نشاط و طرب کے لمحوں میں بھی یہ احساس دلاتی رہتی ہے کہ یہ لمحے بھی باقی رہنے والے نہیں۔ کیونکہ انسان کا مقدر یہ ہے کہ اس کا قلب ہمیشہ فگار اور اس کی چشم ہمیشہ خون فشاں رہے۔

غالب نے ایک رومانی کی حیثیت سے اس حقیقت کو شدت کے ساتھ محسوس کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک ایسا شاعر جو عشق کے رشتے کو صرف خواہش قرار دیتا ہو اور محبوب کی پرستش کو حماقت پر محمول کرتا ہو،[1] جو عاشق ہونے کے باوجود اپنی معشوق فریبی کا ڈھنڈورہ پیٹتا ہو،[2] اور جو عشق کو محض دماغ کا خلل جانتا ہو[3]، وہ جب عشق کی واردات و کیفیات کی ترجمانی کرتا ہے تو اس کے کلام میں ایک گداز اور کسک کی سی

---

(۱) خواہش کو احمقوں نے پرستش دیا قرار
کیا پوجتا ہوں اس بت بیداد گر کو میں

(۲) عاشق ہوں پہ معشوق فریبی ہے مرا کام
مجنوں کو برا کہتی ہے لیلیٰ مرے آگے

(۳) بلبل کے کاروبار پہ ہیں خندہ ہائے گل
کہتے ہیں جس کو عشق خلل ہے دماغ کا

کیفیت پیدا ہو جاتی ہے ۔ یہ گداز دلوں کو تڑپاتا ہے اور یہ کسک احساس غم کی ایک لہر کو بیدار کرتی ہے ۔ لیکن اس کے باوجود اس کی وجہ سے بیزاری کا احساس پیدا نہیں ہوتا ۔ غالب نے عشق و عاشقی کے انفعالی پہلوؤں کی ترجمانی بھی کی ہے ۔ واردات و کیفیات کی مصوری میں بھی وہ پیش پیش رہے ہیں ۔ انہوں نے غم کا بیان بھی کیا ہے لیکن ایسے مواقع پر ان کے اظہار و ابلاغ میں انفعالیت کا رنگ نمایاں نہیں ہوتا اور یاسیت کی تاریکی بھی اپنے پر نہیں پھیلاتی بلکہ جب ان کا فن زندگی کی ان منزلوں سے گذرتا ہے تو وہ اس کی بنیاد اصلیت پر استوار کر کے اس میں ایسا آفاقی رنگ بھرتے ہیں کہ اس کی تہذیب ہو جاتی ہے اور وہ غم انسان اور انسانیت کے لئے گوارا ہو جاتا ہے اور یہ کیفیت اس کے لئے طمانیت اور آسودگی کا باعث بن جاتی ہے ۔ غالب کے فن میں جمالیاتی اظہار کی وہ آن بان اور شان پیدا ہوتی ہے جو صرف انہیں کا حصّہ ہے ۔

یہ اشعار اس کی صحیح ترجمانی کرتے ہیں

عشق سے طبیعت نے زیست کا مزہ پایا
درد کی دوا پائی دردِ بے دوا پایا

دل میں ذوقِ وصل و یادِ یار تک باقی نہیں
آگ اس گھر کو لگی ایسی کہ جو تھا جل گیا

بوئے گل نالۂ دل دودِ چراغِ محفل — جو تری بزم سے نکلا سو پریشاں نکلا

دِل تا جگر کہ ساحلِ دریائے خوں ہے اب
اِس رہگذر میں جلوۂ گُل آگے گَرد تھا

میں نے چاہا تھا کہ اندوہِ وفا سے چھوٹوں
وہ ستمگر مرے مرنے پہ بھی راضی نہ ہوا

کس سے محرومیٔ قسمت کی شکایت کیجیے
ہم نے چاہا تھا کہ مَر جائیں سو وہ بھی نہ ہوا

اب میں ہُوں اور ماتمِ یک شہرِ آرزو
توڑا جو تُو نے آئینہ تمثال دار تھا

غمِ فراق میں تکلیفِ سیرِ گُل مت دو
مجھے دماغ نہیں خندہ ہائے بے جا کا

میں اور بزمِ مے سے یُوں تشنہ کام آؤں
گر میں نے کی تھی توبہ ساقی کو کیا ہُوا تھا

ہوئی مدت کہ غالب مَر گیا پر یاد آتا ہے
وہ ہر اک بات پر کہنا کہ یُوں ہوتا تو کیا ہوتا

تم سے بے جا ہے مجھے اپنی تباہی کا گلہ
اس میں کچھ شائبۂ خوبیٔ تقدیر بھی تھا

دردِ دل لکھوں کب تک جاؤں ان کو دکھلاؤں
انگلیاں فگار اپنی خامہ خوں چکاں اپنا

چھپکے چھپکے مجھ کو روتے دیکھ پاتا ہے اگر
ہنس کے کرتا ہے بیانِ شوخیٔ گفتارِ دوست

آئے ہے بے کسیٔ عشق پہ رونا غالب
کس کے گھر جائے گا سیلابِ بلا میرے بعد

عاشقی صبر طلب اور تمنا بے تاب
دل کا کیا رنگ کروں خونِ جگر ہونے تک

ہیں اور صد ہزار نوائے جگر خراش
تو اور ایک وہ نہ شنیدن کہ کیا کہوں

تماشہ کر اے محوِ آئینہ داری
تجھے کس تمنا سے ہم دیکھتے ہیں !

رازِ معشوق نہ رُسوا ہو جائے
ورنہ مَر جانے میں کچھ بھید نہیں

رہے اُس شوخ سے آزردہ ہم چندے تکلف سے
تکلف برطرف تھا ایک اندازِ جنوں وہ بھی

مجھ سے مت کہہ تو ہمیں کہتا تھا اپنی زندگی
زندگی سے بھی مرا جی اِن دنوں بیزار ہے

ہوئے ہیں پاؤں پہلے ہی نبردِ عشق میں زخمی
نہ بھاگا جائے ہے مجھ سے نہ ٹھہرا جائے ہے مجھ سے

ان اشعار میں مجموعی طور پر جو پہلو نمایاں ہیں، ان میں اصلیت، سادگی اور جدّت کے عناصر سب سے زیادہ اہمیّت رکھتے ہیں۔ غالب نے یہاں جو بات بھی کہی ہے، جس کیفیت کا اظہار بھی کیا ہے، اس میں اظہار کا کوئی نیا پہلو ضرور نمایاں ہوتا ہے۔ غالب کے ان اشعار میں سنجیدگی ہے درد ہے، گداز ہے، کہیں کہیں ان میں ایک کسک کی سی کیفیت بھی ملتی ہے لیکن ان سب کا اظہار ایک پہلو دار انداز میں ہوا ہے اور اسی انداز نے ان کے جمالیاتی اظہار میں جان ڈال دی ہے۔ غالب اس اعتبار سے بہت بڑے فن کار ہیں۔ معمولی واردات و کیفیات میں پہلو پیدا کر کے اس کو نہ صرف اہم بلکہ دل کش بنا دینا ان کے فنی کمال پر دلالت

کرتا ہے۔

جمالیاتی اظہار کی یہ پہلودار کیفیت غالب کی شاعری کے اس حصّے میں کچھ اور بھی زیادہ نمایاں ہوتی ہے جس میں انہوں نے معاشرتی حالات اور حیات و کائنات کے معاملات و مسائل کی ترجمانی کی ہے۔ اس منزل پر پہنچکر غالب زیادہ تہہ داری کے ساتھ اظہار کرتے ہیں اور اس اظہار کو زیادہ پہلودار بناتے ہیں۔ کیونکہ ان کا موضوع اس بات کا تقاضہ کرتا ہے۔ اپنے زمانے کے معاشرتی اور تہذیبی حالات کی ترجمانی اور حیات و کائنات کے بنیادی معاملات و مسائل کی عکاسی کی بنیاد ان کا فکرو شعور ہے۔ اسی فکرو شعور کے سہارے انہوں نے زندگی کے مختلف پہلوؤں کے اسرار و رموز کھولے ہیں اور ان کی فلسفیانہ تحلیل کرکے اُلجھی ہوئی گتھیوں کو سلجھایا ہے۔ یہی سبب ہے کہ ان کے فن میں ایسے مواقع پر زیادہ گہرائی کا احساس ہوتا ہے اور زیادہ وسعتیں نظر آتی ہیں۔ جمالیاتی اظہار کی اس منزل میں وہ گہری سنجیدگی کو اپنا رہنما بناتے ہیں اور پھر اشاروں اور کنایوں کے سہارے آگے بڑھتے ہیں۔ رمزیت اور ایمائیت کا سہارا لیتے ہیں۔ لطیف ابہام کا دامن پکڑتے ہیں۔ ان تمام باتوں سے ان کے فن میں اصلیت اور واقعیت، گہرائی اور گیرائی، وسعت اور ہمہ گیری کی خصوصیات پیدا ہوتی ہیں۔

غالب کی شاعری کا یہ حصّہ فنی اور جمالیاتی اعتبار سے بڑی اہمیت رکھتا ہے کیونکہ اسی مقام پر پہنچکر وہ جمالیاتی اظہار کے نئے سانچے بناتے ہیں اور نئے زاویوں سے اظہار و ابلاغ کے ساتھ ساتھ احساسِ جمال کی تسکین کا سامان فراہم کرتے ہیں۔

یہ اشعار ان کے فن کی جان ہیں اور ان کے آئینے میں ان کا یہ فنی رجحان اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ بے نقاب نظر آتا ہے ؎

نقش فریادی ہے کس کی شوخیٔ تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا

غنچہ پھر لگا کھلنے آج ہم نے اپنا دل
خوں کیا ہوا دیکھا گم کیا ہوا پایا!

دل میں ذوقِ وصل و یادِ یار تک باقی نہیں
آگ اس گھر کو لگی ایسی کہ جو تھا جل گیا

دلِ تا جگر کہ ساحلِ دریائے خوں ہے اب
اس رہگذر میں جلوۂ گُل آگے گرد تھا

مری تعمیر میں مُضمر ہے اک صورت خرابی کی
ہیولا برقِ خرمن کا ہے خونِ گرم دہقاں کا

نظر میں ہے ہماری جادۂ راہ فنا غالبؔ
کہ یہ شیرازہ ہے عالم کے اجزائے پریشاں کا

بقدرِ ظرف ہے ساقی خمارِ تشنہ کامی بھی
جو تو دریائے مے ہے تو میں خمیازہ ہوں ساحل کا

محرم نہیں ہے تو ہی نوا ہائے راز کا
یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا

تاراجِ کاوشِ غمِ ہجراں ہوا اسدؔ
سینہ کہ تھا دفینہ گہر ہائے راز کا

نہ تھا کچھ تو خدا تھا کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا
ڈبویا مجھ کو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

غافل بہ وہمِ ناز خود آرا ہے ورنہ یاں
بے شانۂ صبا نہیں طُرّہ گیاہ کا

عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا
درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا

بخشے ہے جلوۂ گُل ذوقِ تماشا غالب
چشم کو چاہیئے ہر رنگ میں وا ہو جانا

زُنّار باندھ سبحۂ صد دانہ توڑ ڈال
رہرو چلے ہے راہ کو ہموار دیکھ کر

نہ گُلِ نغمہ ہوں نہ پردۂ ساز
میں ہوں اپنی شِکست کی آواز

یک نظر بیش نہیں فرصتِ ہستی غافل
گرمئ بزم ہے اک رقصِ شرر ہونے تک

رونقِ ہستی ہے عشقِ خانہ ویراں ساز سے
انجمن بے شمع ہے گر برق خرمن میں نہیں

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صُورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

ہے آدمی بجائے خود اک محشرِ خیال
ہم انجمن سمجھتے ہیں خلوت ہی کیوں نہ ہو!

خیالِ مرگ کب تسکین دلِ آزردہ کو بخشے
مرے دامِ تمنّا میں ہے اک صیدِ زبوں وہ بھی

مَے عشرت کی خواہش ساقیٔ گردوں سے کیا کیجئے
لئے بیٹھا ہے اک دو چار جامِ واژگوں وہ بھی

ہستی کے مت فریب میں آجائیو اسدؔ
عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے

غنچۂ تا شگفتن ہا برگِ عافیت معلوم
باوجود دل جمعی خوابِ گل پریشان ہے

پنہاں تھا دام سخت قریب آشیاں کے
اُڑنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہم ہوئے

سختی کشانِ عشق کی پوچھے ہے کیا خبر
وہ لوگ رفتہ رفتہ سراپا الم ہوئے

تیری وفا سے کیا ہو تلافی کہ دہر میں
تیرے سوا بھی ہم پہ بہت سے ستم ہوئے

لکھتے رہے جنوں کی حکایاتِ خوں چکاں
ہر چند اِس میں ہاتھ ہمارے قلم ہوئے

ہوئی جن سے توقع خستگی کی داد پانے کی
وہ ہم سے بھی زیادہ خستۂ تیغِ ستم نکلے

کس کا سُراغ جلوہ ہے حیرت کو اے خدُا
آئینہ فرشِ شش جہتِ انتظار ہے

اے پرتوِ خورشیدِ جہاں تاب اِدھر بھی
سائے کی طرح ہم پہ عجب وقت پڑا ہے

جوشِ جنوں سے کچھ نظر آتا نہیں اسدؔ
صحرا ہماری آنکھ میں یک مُشتِ خاک ہے

ان اشعار کی معنویت وسیع اور ہمہ گیر ہے۔ ان میں کہیں انسانی زندگی کی بے ثباتی کا شکوہ ہے کہیں اس زندگی میں انسان کی محرومی کا بیان ہے۔ کہیں اس بے ثباتی اور محرومی پر غم کا اظہار ہے کہیں فنا کا ذکر ہے، کہیں انسان اور خدا کے تعلق کی وضاحت ہے۔ کہیں انسان دوستی کا درس ہے۔ کہیں انسان کی بلندی اور برتری کا خیال ہے۔ غالب نے ان موضوعات کی ترجمانی محض فلسفیانہ انداز میں نہیں کی ہے۔ ان سب کو تجربے میں سمویا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس قسم کے موضوعات نے ان کی شاعری میں شاعرانہ روپ اختیار کیا ہے۔ ان میں فکری سنجیدگی کا رنگ ضرور نمایاں ہے لیکن ان گہرے موضوعات کو شعریت کے سانچے میں ڈھال کر پیش کرنے کے لئے

غالب کو اشاروں اور علامتوں کا سہارا لینا پڑا ہے ۔ یہی سبب ہے کہ ان کے جمالیاتی اظہار میں رمزیت، ایمائیت اور تہ داری کی کیفیت پیدا ہو گئی ہے ۔ اور یہ ان کے فن کی نمایاں ترین خصوصیت ہے ۔

غرض غالب کی شاعری کے متنوع موضوعات نے ان کے فن اور جمالیاتی اظہار میں بھی تنوع پیدا کیا ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری میں جمالیاتی اظہار و ابلاغ بھی مختلف طریقوں سے ہوا ہے ۔ اور ان کے فن میں اس اظہار کے مختلف روپ ملتے ہیں ۔ غالب کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے اس جمالیاتی اظہار کو موضوع کے ساتھ مکمل طور پر ہم آہنگ کیا ہے ۔ اور ان دونوں کے درمیان پوری طرح مناسبت پیدا کی ہے اور مناسبت اور ہم آہنگی کا یہ عمل ان کا ایک اہم فنی کارنامہ ہے ۔

وزن و آهنگ

شاعری اور شاعرانہ فن کاری کی بنیاد درحقیقت وزن و آہنگ ہے اس کے بغیر شاعری اور اس کے فن کا کوئی تصور نہیں کیا جا سکتا۔ شاعری کے تمام عناصر اسی محور کے گرد گھومتے ہیں۔ وزن و آہنگ ان سب کو اس طرح ایک رشتے میں منسلک کرتا ہے کہ ان میں مجموعی طور پر ایک مناسبت اور ہم آہنگی پیدا ہو جاتی ہے اور اس طرح وہ شاعرانہ فن کاری کا سب سے اہم عنصر بن جاتا ہے۔ اس کی حیثیت تخلیقی ہوتی ہے اور وہ شاعر کے تخلیقی مزاج کو پوری طرح ظاہر کرتا ہے۔ دراصل وہ ایک ایسا آئینہ ہے جس میں شاعر کی تخلیقی رو کا عکس صاف دکھائی دیتا ہے۔ اس کو خیال اور موضوع کا رقص دلفریب کہا جائے تو بے جا نہیں۔ شاعری کا موضوع اور خیال ایک متحرک چیز ہے۔ حرکت ہی کی وجہ سے اس کا وجود ہوتا ہے اور وہ اسی حرکت کے سہارے ایک صورت اختیار

کرتا ہے۔ یہ حرکت ہی درحقیقت وہ وزن و آہنگ ہے جو مواد اور موضوع کی صورت اور ہئیت کو وجود میں لاتا ہے اور مجموعی طور پر شعری تجربے کے مخصوص آہنگ کی پوری طرح عکاسی کرتا ہے۔

غالب کی شاعری میں بھی وزن و آہنگ کی یہی صورت ہے وہ ان کے تجربات کا پابند ہے اور ان کے مخصوص جذبات واحساسات اور فکر وشعور کے ساتھ پوری طرح مناسبت رکھتا ہے اور اس میں ان کے فکر وشعور کی جھلک بھی نظر آتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس میں یکسانی اور یک رنگی نہیں ہے۔ برخلاف اس کے جو رنگا رنگی ان کے شاعرانہ تجربات میں ہے وہی ان کی شاعری کے وزن و آہنگ میں بھی دکھائی دیتی ہے۔

اس سے قبل اس حقیقت کی وضاحت تفصیل سے کی جا چکی ہے کہ غالب زندگی اور حرکت کے شاعر ہیں۔ ان کے یہاں انفعالیت پسندی نہیں ہے۔ یہی سبب ہے کہ ان کی بیشتر غزلوں میں ایسا وزن و آہنگ ملتا ہے جو انفعالیت سے زیادہ فعالیت کا ترجمان ہے بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہے کہ مجموعی طور پر ان کی غزلوں کے آہنگ میں ایک بلند آہنگی نظر آتی ہے۔ ان کا آہنگ رواں دواں ہے۔ اس کی کیفیت میدانوں میں بہنے والے دریا کی لہروں کی سی نہیں ہے بلکہ سمندروں میں پیدا ہونے والے مد و جزر کی سی ہے۔

بات دراصل یہ ہے کہ غالب بنیادی طور پر رومانی ہیں اور ایک رومانی کی حیثیت سے ان کی طبیعت میں ایک تیزی اور تندی ہے۔ چنانچہ یہی تیزی اور تندی ان کی شاعری کے آہنگ میں بھی ملتی ہے۔ اس سلسلے

میں سب سے پہلے ان کی شاعری کو دیکھنے اور سننے والے کی نظر بحروں کے انتخاب پر پڑتی ہے۔ غالب نے اپنے فنّی اظہار کے لئے بیشتر رواں دواں بحروں کا استعمال کیا ہے۔ ان کے یہاں بہت طویل بحریں نہیں ہیں۔ بہت چھوٹی بحریں بھی انہوں نے استعمال نہیں کی ہیں۔ صرف کسی خاص موڈ کو پیش کرنے کے لئے انہوں نے بعض چھوٹی بحروں سے کام لیا ہے۔ لیکن ان چھوٹی بحروں کو انگلیوں پر گنا جا سکتا ہے۔ بیشتر بحریں جو ان کی شاعری میں استعمال ہوئی ہیں، وہ ایسی ہیں جن میں تیز اور تند خیالات آسانی سے سما سکتے ہیں، جن میں تخیّل کی پرواز کو بھی اسیر کیا جا سکتا ہے، جن میں نشاط و طرب کے معاملات بھی بخوبی ادا ہو سکتے ہیں اور جن میں غمِ دل، غمِ روزگار اور غمِ حیات کی واردات کو بھی اچھی طرح ظاہر کیا جا سکتا ہے۔

بحروں کے انتخاب اور استعمال میں شاعر کی مخصوص ذہنی کیفیت اپنے آپ کو پوری طرح نمایاں کرتی ہے۔ غالب ایک ایسی شخصیت کے شاعر ہیں کہ چاہے وہ کسی قسم کے جذبات کی ترجمانی کریں، ان کی اس ذہنی کیفیت کا عکس ان میں ہر جگہ نظر آتا ہے۔ مثلاً وہ کسی عالم میں بھی جینے اور زندہ رہنے کی آرزو کو خیرباد نہیں کہہ سکتے۔ انتہائی ناسازگار حالات میں بھی اس خواہش اور آرزو کا چراغ ان کے یہاں فروزاں رہتا ہے۔ ناسازگار حالات بھی ان کے خیال میں زندگی کا حصّہ ہیں۔ اس لئے وہ ان کو برداشت کر سکتے ہیں۔ ان کو سازگار بنانے کے لئے بعض صورتیں نکال سکتے ہیں۔ اگر یہ صورتیں نہ پیدا ہوں تو وہ کبھی اس کو زندگی کا قانون تصور کر کے کبھی انسان کو ان کے سامنے مجبور اور معذور خیال کر کے اپنے آپ کو

مطمئن کر لیتے ہیں۔ اور بعض دوسرے راستوں پر چل پڑتے ہیں اور کسی نئے افق پر پرواز کرنے لگتے ہیں۔

غالب نے جن بحروں کو زیادہ استعمال کیا ہے، ان کے پس منظر میں یہی صورتِ حال نظر آتی ہے۔ مثلاً ان کے یہاں جو مخصوص بحریں بعض مخصوص خیالات اور جذبات و احساسات کی ترجمانی کے لئے زیادہ استعمال ہوئی ہیں، ان کا اندازہ مندرجہ ذیل اشعار سے ہو سکتا ہے

نقش فریادی ہے کس کی شوخیٔ تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا

عشق سے طبیعت نے زیست کا مزہ پایا
درد کی دوا پائی درد بے دوا پایا

میں ہوں اور افسردگی کی آرزو غالب کہ دل
دیکھ کر طرزِ تپاکِ اہلِ دنیا جل گیا

دل میں پھر گریہ نے اک شور مچایا غالب
آہ جو قطرہ نہ نکلا تھا سو طوفاں نکلا

دھمکی میں مر گیا جو نہ بابِ نبرد تھا
عشقِ نبرد پیشہ طلب گارِ مرد تھا

دہر میں نقشِ وفا وجہِ تسلّی نہ ہوا
ہے یہ وہ لفظ کہ شرمندۂ معنی نہ ہوا

ستائش گر ہے زاہد اس قدر جس باغِ رضواں کا
وہ اک گلدستہ ہے ہم بیخودوں کے طاقِ نسیاں کا

دکھاؤں گا تماشا دی اگر فرصت زمانے نے
مرا ہر داغِ دل اک تخم ہے سروِ چراغاں کا

محبّت تھی چمن سے لیکن اب یہ بے دماغی ہے
کہ موجِ بوئے گل سے ناک میں آتا ہے دم میرا

سراپا رہنِ عشق و ناگزیرِ الفتِ ہستی
عبادت برق کی کرتا ہوں اور افسوس حاصل کا

محرم نہیں ہے تو ہی نواہائے راز کا
یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا

شب ہوئی پھر انجمِ رخشندہ کا منظر کھُلا
اس تکلّف سے کہ گویا بت کدے کا در کھُلا

شب کہ برقِ سوزِ دل سے زہرۂ ابر آب تھا
شعلۂ جوالہ ہر اک حلقۂ گرداب تھا

بس کہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا
آدمی کو بھی میسّر نہیں انساں ہونا

دوست غم خواری میں میری سعی فرمائیں گے کیا
زخم کے بھرنے تلک ناخن نہ بڑھ آئیں گے کیا

میں اور بزمِ مے سے یوں تشنہ کام آؤں
گر میں نے کی تھی توبہ ساقی کو کیا ہوا تھا

عرضِ نیازِ عشق کے قابل نہیں رہا
جس دل پہ ناز تھا مجھے وہ دل نہیں رہا!

ذکر اس پری وش کا اور پھر بیاں اپنا
بن گیا رقیب آخر تھا جو رازداں اپنا

غافل بہ وہمِ ناز خود آرا ہے ورنہ یاں
بے شانۂ صبا نہیں طرّہ گیاہ کا

غم نہیں ہوتا ہے آزادوں کو بیش از یک نفس
برق سے کرتے ہیں روشن شمعِ ماتم خانہ ہم

ہم سے کھُل جاؤ بہ وقتِ مے پرستی ایک دن
ورنہ ہم چھیڑیں گے رکھ کر عذرِ مستی ایک دن

دائم پڑا ہوا ترے دَر پر نہیں ہُوں میں
خاک ایسی زندگی پہ کہ پتھر نہیں ہُوں میں

سب کہاں کچھ لالہ و گُل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

دیوانگی سے دوش پہ زُنّار بھی نہیں
یعنی ہماری جیب میں اک تار بھی نہیں

کسی کو دے کے دِل کوئی نوا سنجِ فغاں کیوں ہو
نہ ہو جب دِل ہی پہلو میں تو پھر منہ میں زباں کیوں ہو

ہے بزمِ بتاں میں سخن آزردہ لبوں سے
تنگ آئے ہیں ہم ایسے خوشامد طلبوں سے

مری ہستی فضائے حیرت آبادِ تمنّا ہے
جسے کہتے ہیں نالہ وہ اسی عالم کا عنقا ہے

دیکھنا قسمت کہ آپ اپنے پہ رشک آجائے ہے
میں اُسے دیکھوں بھلا کب مجھ سے دیکھا جائے ہے

غالب کی پسندیدہ بحریں یہی ہیں جن میں مندرجہ بالا اشعار کی تخلیق کی گئی ہے۔ ان بحروں کا آہنگ رواں دواں ہے۔ ان میں تیزی اور تُندی ہے۔ ان میں ایک رکھ رکھاؤ ہے۔ ایک لئے دیئے رہنے والی کیفیت ہے۔ غالب نے ان بحروں میں اپنے خیالات کا لہو دوڑا کر جن اشعار کی تخلیق کی ہے ان کے تجربے کا آہنگ ان بحروں کے آہنگ سے پوری طرح مُناسبت رکھتا ہے۔ غالب کے تجربے کی گہرائی نے ان بحروں کو زیادہ مترنّم بنا دیا ہے۔ تجربے کی نسبت سے ان بحروں میں الفاظ کی مخصوص دروبست نے ان کے اندر زیادہ نغمگی اور موسیقیت کی کیفیت پیدا کر دی ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ اپنی ان پسندیدہ بحروں میں غالب نے مختلف نوعیت کے تجربات کو سمو دیا ہے لیکن ان کے موڈ کی ہم آہنگی اور وحدت کو ٹھیس نہیں لگتی، اور وہ موڈ زندہ رہنے، دوسروں کو زندہ رکھنے، زندگی کی مسرتوں سے سینہ بھر لینے اور ان مسرتوں کو عام کرنے کا موڈ ہے۔ غالب کی ان پسندیدہ بحروں کا آہنگ اسی موڈ کا آہنگ ہے جو ان کے فن میں ہر جگہ نمایاں نظر آتا ہے۔

اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ غالب کے یہاں اس موڈ کے علاوہ کوئی

اور موڈ طاری ہی نہیں ہوتے۔ ایسا نہیں ہے۔ ان کے یہاں شاعری میں ایسے موڈ بھی ملتے ہیں جن میں حُزن و یاس کا آہنگ غالب معلوم ہوتا ہے۔ غالب کے ایسے رومانی مزاج شاعر کے یہاں اس موڈ کا پیدا ہونا ایسا کچھ عجیب نہیں۔ جیسا کہ اِس سے قبل بھی کہا جا چکا ہے ایک رومانی شاعر کو اس قسم کے موڈ کا سامنا ضرور کرنا پڑتا ہے۔ غالب پر بھی ایسے موڈ طاری ہوئے ہیں۔ چنانچہ اس موڈ کی ترجمانی اور عکاسی کرنے کے لئے اُنھوں نے چھوٹی بحریں استعمال کی ہیں۔ ان کے دیوانوں میں ان چھوٹی بحروں کی تعداد، دوسری بحروں کے مقابلے میں نسبتاً بہت کم ہے۔ لیکن جتنی غزلیں بھی چھوٹی بحروں میں ہیں وہ آہنگ اور وزن کے اعتبار سے نہایت مؤثر ہیں۔ ان کا آہنگ تو دلوں میں نشتر بن کر اُتر جاتا ہے بلکہ ایک ایسے تیرِ نیم کش کی حیثیت اختیار کر لیتا ہے جو دِل میں اُترتا تو ہے لیکن جگر کے پار نہیں ہوتا۔

غالب کی چھوٹی بحروں کے یہ اشعار ان کے تجربے کی اسی کیفیت کو ظاہر کرتے ہیں ؎

ہوس کو ہے نشاطِ کار کیا کیا
نہ ہو مرنا تو جینے کا مزہ کیا

تجاہل پیشگی سے مدعا کیا
کہاں تک اے سراپا ناز کیا کیا

نوازش ہائے بے جا دیکھتا ہوں
شکایت ہائے رنگیں کا گلا کیا

کیا کس نے جگرداری کا دعویٰ
شکیبِ خاطرِ عاشق بھلا کیا

بلا سے جان ہے غالبؔ اس کی ہر بات
عبارت کیا اشارت کیا ادا کیا

دردِ منّت کشِ دوا نہ ہوا — میں نہ اچھا ہُوا بُرا نہ ہوا
ہم کہاں قسمت آزمانے جائیں — تو ہی جب خنجر آزما نہ ہوا
ہے خبر گرم اُن کے آنے کی — آج ہی گھر میں بوریا نہ ہوا
زخم گر دب گیا لہو نہ تھما — کام گر رُک گیا روا نہ ہوا
کچھ تو پڑھیئے کہ لوگ کہتے ہیں
آج غالبؔ غزل سرا نہ ہوا

پھر مجھے دیدۂ تر یاد آیا — دل جگر تشنۂ فریاد آیا
دم لیا تھا نہ قیامت نے ہنوز — پھر ترا وقتِ سفر یاد آیا
زندگی یوں بھی گذر ہی جاتی — کیوں ترا راہگذر یاد آیا
پھر ترے کوچے کو جاتا ہے خیال — دلِ گم گشتہ مگر یاد آیا
کوئی ویرانی سی ویرانی ہے — دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا
میں نے مجنوں پہ لڑکپن میں اسدؔ
سنگ اُٹھایا تھا کہ سر یاد آیا

نہ گُلِ نغمہ ہوں نہ پردۂ ساز — میں ہوں اپنی شکست کی آواز
تو اور آرائشِ خمِ کاکل — میں اور اندیشہ ہائے دُور دراز
ہوں گرفتارِ اُلفتِ صیّاد — ورنہ باقی ہے طاقتِ پرواز
مجھ کو پوچھا تو کچھ غضب نہ ہوا — میں غریب اور تو غریب نواز
اسدؔ اللہ خاں تمام ہوا
اے دریغا وہ رندِ شاہد باز

وہ فراق اور وہ وصال کہاں — وہ شب و روز و ماہ و سال کہاں
فرصتِ کاروبارِ شوق کسے — ذوقِ نظارۂ جمال کہاں
تھی وہ اک شخص کے تصور سے — اب وہ رعنائیِ خیال کہاں
ایسا آساں نہیں لہو رونا — دل میں طاقت جگر میں حال کہاں
مضمحل ہو گئے قویٰ غالب
وہ عناصر میں اعتدال کہاں

جہاں تیرا نقشِ قدم دیکھتے ہیں — خیاباں خیاباں ارم دیکھتے ہیں
بنا کر فقیروں کا ہم بھیس غالب
تماشائے اہلِ کرم دیکھتے ہیں

رازِ معشوق نہ رسوا ہو جائے — ورنہ مر جانے میں کچھ بھید نہیں
گردشِ رنگِ طرب سے ڈر ہے — غمِ محرومیِ جاوید نہیں
کہتے ہیں جیتے ہیں امید پہ لوگ
ہم کو جینے کی بھی امید نہیں

آہ کا کس نے اثر دیکھا ہے — ہم بھی اک اپنی ہوا باندھتے ہیں
اہلِ تدبیر کی واماندگیاں — آبلوں پر بھی حنا باندھتے ہیں
سادہ و پرکار ہیں خوباں غالب
آبلوں پر بھی حنا باندھتے ہیں

عشق مجھ کو نہیں وحشت ہی سہی　　میری وحشت تری شہرت ہی سہی
ہم بھی تسلیم کی خو ڈالیں گے　　بے نیازی تری عادت ہی سہی

یار سے چھیڑ چلی جائے اسدؔ
گر نہیں وصل تو حسرت ہی سہی

کوئی دن گر زندگانی اور ہے　　اپنے جی میں ہم نے ٹھانی اور ہے

ہو چکیں غالبؔ بلائیں سب تمام
ایک مرگِ ناگہانی اور ہے

کوئی اُمید بر نہیں آتی　　کوئی صورت نظر نہیں آتی
آگے آتی تھی حالِ دل پہ ہنسی　　اب کسی بات پر نہیں آتی
مرتے ہیں آرزو میں مرنے کی　　موت آتی ہے پر نہیں آتی

کعبے کس مُنہ سے جاؤ گے غالبؔ
شرم تُم کو مگر نہیں آتی !

دلِ ناداں تجھے ہُوا کیا ہے　　آخر اس درد کی دوا کیا ہے
ہم ہیں مُشتاق اور وہ بیزار　　یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے
میں بھی مُنہ میں زبان رکھتا ہوں　　کاش پوچھو کہ مُدعا کیا ہے
پھر کچھ اک دل کو بیقراری ہے　　سینہ جویائے زخمِ کاری ہے
پھر جگر کھودنے لگا ناخن　　آمدِ فصلِ لالہ کاری ہے
وہی صد رنگ نالہ فرسائی　　وُہی صد گونہ اشکباری ہے

بے خودی بے سبب نہیں غالبؔ
کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے

غیر لیں محفل میں بوسے جام کے ہم رہیں یوں تشنہ لب پیغام کے
خستگی کا تم سے کیا شکوہ کہ یہ ہتھکنڈے ہیں چرخِ نیلی فام کے
عشق نے غالبؔ نکما کر دیا
ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے!

کب وہ سنتا ہے کہانی میری اور پھر وہ بھی زبانی میری
خلشِ غمزۂ خوں ریز نہ پوچھ دیکھ خوں نابہ فشانی میری
کیا بیاں کرکے مرا روئیں گے یار مگر آشفتہ بیانی میری
کر دیا ضعف نے عاجز غالبؔ
ننگِ پیری ہے جوانی میری

غالبؔ کے متداول دیوان میں چھوٹی بحروں کی یہ غزلیں پندرہ بیس سے زیادہ نہیں ہیں۔ لیکن جیسا کہ ان غزلوں کے مندرجہ بالا انتخاب سے ظاہر ہے، ان کا مخصوص وزن و آہنگ غالب کی اس مخصوص ذہنی کیفیت کی عکاسی اور اس خاص موڈ کی ترجمانی کرتا ہے جس سے وہ اس وقت گذرے ہیں جب ان اشعار کی تخلیق کا سلسلہ جاری تھا۔ ان میں سے بیشتر اشعار کے آہنگ میں آہستہ روی اور دھیما پن ہے اس لئے کہ غالب نے جن تجربات کو اس وزن و آہنگ

کے سانچے میں ڈھالا ہے اس میں کسی نہ کسی حد تک ایک حزینہ کیفیت ضرور ہے۔ اس حزینہ کیفیت کا منبع کہیں احساس محرومی ہے، کہیں ماضی کا ماتم، کہیں نشاط و طرب سے علیحدگی، کہیں انسانیت کا غم، لیکن وہ آہنگ جو اس حزینہ کیفیت کا ترجمان ہے اس کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ دلوں میں اتر جاتا ہے۔ حواس کے تاروں کو چھیڑتا ہے اور اس طرح احساسِ جمال کی تسکین کا باعث بنتا ہے۔

اس آہنگ میں جو غالب کے یہاں پیدا ہوتا ہے وہ موسیقیت اور نغمگی ہے جو خود انسانی زندگی کے نشیب و فراز اور اس سے پیدا ہونے والے آہنگ میں پائی جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس میں اس آہنگ کی جھلک نظر آتی ہے جس کو ورڈ سورتھ نے (STILL SAD MUSIC OF HUMANITY) کہا ہے۔ اس آہنگ کے ساتھ انسان مانوس ہے کیونکہ وہ بہرحال اسی کے سائے میں زندگی بسر کرتا ہے۔ غالب نے اس آہنگ کی تخلیق میں گہرے انسانی شعور کا اظہار کیا ہے۔

غالب الفاظ کے مخصوص دروبست سے بھی اپنے وزن و آہنگ میں ایک ایسی موسیقیت اور نغمگی پیدا کرنے میں کامیاب ہوتے ہیں جو ان کی شاعری کے آہنگ میں جان ڈال دیتی ہے۔ غالب کے شاعرانہ تجربے میں جو باقاعدگی اور نظم و ضبط ہے اس کی جھلک الفاظ کے اس استعمال میں بھی نظر آتی ہے جو ایک مخصوص دروبست کی وجہ سے ان کی شاعری کے آہنگ کو موسیقیت اور نغمگی سے ہمکنار کرتے ہیں۔ یوں تو غالب کی شاعری کے آہنگ میں یہ موسیقیت اور نغمگی ہر جگہ ملتی ہے لیکن مندرجہ

ذیل چند اشعار اس کی بہترین مثالیں ہیں۔

دل گذرگاہ خیال مے و ساغر ہی سہی
گر نفس جادۂ سر منزل تقویٰ نہ ہوا

خموشی میں نہاں خوں گشتہ لاکھوں آرزوئیں ہیں
چراغ مردہ ہوں میں بے زباں گورِ غریباں کا

نہیں معلوم کس کس کا لہو پانی ہوا ہو گا
قیامت ہے سرشک آلودہ ہونا تیری مژگاں کا

ہیں بس کہ جوشِ بادہ سے شیشے اچھل رہے
ہر گوشۂ بساط ہے سرِ شیشہ باز کا

گرچہ ہوں دیوانہ پر کیوں دوست کا کھاؤں فریب
آستین میں دشنہ پنہاں ہاتھ میں خنجر کھلا

نوازش ہائے بے جا دیکھتا ہوں
شکایت ہائے رنگیں کا گلا کیا

اسدؔ ہم وہ جنوں جولاں گدائے بے سر و پا ہیں
کہ ہے سر پنجۂ مژگانِ آہو پشت خار اپنا

تم سے بے جا ہے مجھے اپنی تباہی کا گلہ
اس میں کچھ شائبۂ خوبیٔ تقدیر بھی تھا

غافل بہ وہم ناز خود آرا ہے ورنہ یاں
بے شانۂ صبا نہیں طرہ گیاہ کا

تو اور آرائشِ خمِ کاکل
میں اور اندیشہ ہائے دور و دراز

غم نہیں ہوتا ہے آزادوں کو بیش از یک نفس
برق سے کرتے ہیں روشن شمعِ ماتم خانہ ہم

فرصتِ کاروبارِ شوق کسے
ذوقِ نظارۂ جمال کہاں

یاد تھیں ہم کو بھی رنگا رنگ بزم آرائیاں
لیکن اب نقش و نگارِ طاقِ نسیاں ہو گئیں

پرسشِ طرزِ دلبری کیجیے کیا کہ بن کہے
اُس کے ہر اک اشارے سے نکلے ہے یہ ادا کہ یوں

مئے عشرت کی خواہش ساقیٔ گردوں سے کیا کیجے
لیے بیٹھا ہے اک دو چار جامِ واژگوں وہ بھی

کس طرح کاٹے کوئی شب ہائے تارِ برشگال
ہے نظر خو کردۂ اختر شماری ہائے ہائے

چشمِ خوباں خامشی میں بھی نوا پرداز ہے
سرمہ تو کہوے کہ دودِ شعلۂ آواز ہے

گرچہ ہے طرزِ تغافل پردہ دارِ رازِ عشق
پر ہم ایسے کھوئے جاتے ہیں کہ وہ پا جائے ہے

جلوہ زارِ آتشِ دوزخ ہمارا دِل سہی
فتنۂ شورِ قیامت کس کی آب و گِل میں ہے

ان اشعار میں گذر گاہِ خیالِ مے و ساغر، جادۂ سر منزلِ تقویٰ، خموشی میں نہاں خون گشتہ لاکھوں آرزوئیں، سرشک آلودہ ہونا تیری مژگان کا، جوشِ بادہ سے شیشے اُچھل رہے ہیں۔ آستین میں دشنہ پنہاں، ہاتھ

میں خنجر کھلا، نوازش ہائے بے جا، شکایت ہائے رنگین، سرپنجۂ مژگان آہو، شائبۂ خوبیٔ تقدیر، بے شانۂ صبا، آرائشِ خم کاکل، اندیشہ ہائے دور و دراز، برق سے کرتے ہیں روشن شمع ماتم خانہ ہم، فرصت کاروبارِ شوق، ذوقِ نظارۂ جمال، رنگا رنگ بزم آرائیاں، نقش و نگار طاق نسیاں، پرسشِ طرزِ دلبری، مے عشرت کی خواہش، دو چار جام واژگون، شب ہائے تار برشگال، خوکردۂ اختر شماری، چشم خوباں خامشی میں بھی، دودِ شعلۂ آواز، پردہ دار رازِ عشق، جلوہ زار آتشِ دوزخ، فتنۂ شورِ قیامت وغیرہ کی بے شمار ترکیبوں، فقروں اور جملوں میں جو نغمگی اور موسیقیت ہے وہ بڑی ہی دلنشین اور دل آویز ہے۔ اور ان کی اس دل نشینی اور دل آویزی کو اندازہ دانی پڑھنے والے اور سننے والے کے حواس ہی کر سکتے ہیں۔ غالب کا کلام اس قسم کی نغمگی اور موسیقیت سے بھرا پڑا ہے۔ یہ بہ ذات خود بھی اہم ہے۔ لیکن مجموعی طور پر یہ نغمگی اور موسیقیت اُن کی شاعری کے مجموعی آہنگ پر بھی اثر انداز ہوتی ہے اور اس کو زیادہ مؤثر بنا کر جمالیاتی اعتبار سے زیادہ دلنشین و دلفریب بناتی ہے۔

اس اعتبار سے غالب بڑے چابک دست فن کار ہیں۔ وہ صرف ترکیبوں، فقروں اور جملوں کی تراش خراش ہی سے اپنی شاعری کے آہنگ کو مؤثر نہیں بناتے۔ بعض خاص کیفیات کی وضاحت کے لئے ایسی مترنم زمینوں کا انتخاب کرتے ہیں جو الفاظ اور ان کی ترکیبوں کی مخصوص دروبست سے کچھ زیادہ ہی مترنم ہو جاتی ہیں اور ان کی شاعری کا مجموعی آہنگ ان کے ہاتھوں زیادہ جان دار اور مؤثر ہو جاتا ہے۔ دیکھئے کہ کیسی کیسی دل کش زمینوں میں غالب نے طبع آزمائی کی ہے اور الفاظ کے مخصوص

استعمال، ترکیبوں کی مخصوص تراش خراش اور فقروں کے مخصوص دروبست سے انہوں نے مندرجہ ذیل غزلوں میں ترنم، موسیقیت اور نغمگی کی ایسی کیفیت کو ابھار دیا ہے جو ایک رقص دلفریب کے منظر لطیف کو آنکھوں کے سامنے لاکر کھڑا کر دیتی ہے۔ یہ غزلیں کیا ہیں خود شاعری اور اس کے فن کا ایک رقص دلفریب ہیں ؎

کہتے ہو نہ دیں گے ہم دل اگر پڑا پایا
دل کہاں کہ گم کیجئے ہم نے مدعا پایا

عشق سے طبیعت نے زیست کا مزہ پایا
درد کی دوا پائی دردِ بے دوا پایا

دوست دار دشمن ہے اعتمادِ دل معلوم
آہ بے اثر دیکھی نالہ نارسا پایا

سادگی و پرکاری بے خودی و ہشیاری
حسن کو تغافل میں جرأت آزما پایا

غنچہ پھر لگا کھلنے آج ہم نے اپنا دل
خوں کیا ہوا دیکھا، گم کیا ہوا پایا!

حالِ دل نہیں معلوم لیکن اس قدر یعنی
ہم نے بارہا ڈھونڈا، تم نے بارہا پایا

شورِ پندِ ناصح نے زخم پر نمک چھڑکا
آپ سے کوئی پوچھے تم نے کیا مزا پایا

ذکر اس پری وش کا اور پھر بیان اپنا
بن گیا رقیب آخر تھا جو راز داں اپنا

منظر اک بلندی پر اور ہم بنا سکتے
عرش سے ادھر ہوتا کاش کہ مکان اپنا

دے وہ جس قدر ذلت ہم ہنسی میں ٹالیں گے
بارے آشنا نکلا ان کا پاسبان اپنا

دردِ دل لکھوں کب تک جاؤں ان کو دکھلاؤں
انگلیاں فگار اپنی خامہ خوں چکاں اپنا

تا کرے نہ غمازی، کر لیا ہے دشمن کو
دوست کی شکایت میں ہم نے ہم زباں پایا

ہم کہاں کے دانا تھے کس ہنر میں یکتا تھے
بے سبب ہوا غالبؔ دشمن آسماں اپنا

دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت درد سے بھر نہ آئے کیوں
روئیں گے ہم ہزار بار کوئی ہمیں ستائے کیوں ! !

دیر نہیں، حرم نہیں، در نہیں آستان نہیں
بیٹھے ہیں رہ گذر پہ ہم کوئی ہمیں اُٹھائے کیوں

جب وہ جمالِ دل فروز صورتِ مہرِ نیم روز
آپ ہی ہو نظارہ سوز پردے میں منہ چھپائے کیوں

دشنۂ غمزہ جاں ستاں ناوکِ ناز بے پناہ
تیرا ہی عکسِ رُخ سہی سامنے تیرے آئے کیوں

قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

حسن اور اس پہ حسن ظن رہ گئی بوالہوس کی شرم
اپنے پہ اعتماد ہے غیر کو آزمائے کیوں

واں وہ غرور عز و ناز، یاں یہ حجاب پاسِ وضع
راہ میں ہم ملیں کہاں بزم میں وہ بلائے کیوں

ہاں وہ نہیں خدا پرست جاؤ وہ بے وفا سہی
جس کو ہو دین و دل عزیز اس کی گلی میں جائے کیوں

غالبؔ خستہ کے بغیر کون سے کام بند ہیں
روئیے زار زار کیوں، کیجیے ہائے ہائے کیوں

غنچۂ ناشگفتہ کو دور سے مت دکھا کہ یوں
بوسے کو پوچھتا ہوں میں منہ سے مجھے بتا کہ یوں

پرسشِ طرزِ دلبری کیجیے کیا کہ بن کہے
اس کے ہر اک اشارے سے نکلے ہے یہ ادا کہ یوں

رات کے وقت مے پیے ساتھ رقیب کو لیے
آئے وہ یاں خدا کرے پر نہ خدا کرے کہ یوں

غیر سے رات کیا بنی یہ جو کہا کہ دیکھیے
سامنے آن بیٹھنا اور دیکھنا کہ یوں

بزم میں اس کے روبرو کیوں نہ خموش بیٹھیے
اس کی تو خامشی میں بھی ہے یہی مدعا کہ یوں

میں نے کہا کہ بزمِ ناز چاہیئے غیر سے تہی
سُن کے ستم ظریف نے مجھ کو اُٹھا دیا کہ یُوں

مجھ کو کہا جو یار نے جاتے ہیں ہوش کس طرح
دیکھ کے میری بے خودی چلنے لگی ہوا کہ یُوں

کب مجھے کوئے یار میں رہنے کی وضع یاد تھی
آئینہ دار بن گئی حیرتِ نقشِ پا کہ یُوں!

گر ترے دل میں ہو خیال وصل میں شوق کا زوال
موجِ محیطِ آب میں مارے ہے دست و پا کہ یُوں

جو یہ کہے کہ ریختہ کیونکہ ہو رشکِ فارسی
گفتۂ غالب ایک بار پڑھ کے اُسے سُنا کہ یُوں

کارگاہِ ہستی میں لالہ داغ ساماں ہے
برقِ خرمنِ راحت خونِ گرمِ دہقاں ہے

غنچہ تا شگفتن ہا برگِ عافیت معلوم
باوجودِ دلجمعی خوابِ گُل پریشاں ہے

ہم سے رنجِ بے تابی کس طرح اٹھایا جائے
داغِ پشتِ دستِ عجز شعلہ خس بدنداں ہے

یہ پانچ غزلیں غالب کے متداول دیوان میں ایسی ہیں جن کو پڑھ کر خود پڑھنے والے کا احساسِ جمال رقص کرتا ہے کیونکہ جن زمینوں میں یہ کہی گئی ہیں، اُن میں بذاتِ خود بھی ایک رقص کا سا عالم نظر آتا ہے۔ پھر ان میں شاعر

کے خیالات رقص کرتے ہیں، اس کے احساسات رقص کرتے ہیں۔ الفاظ رقص کرتے ہیں، ترکیبیں رقص کرتی ہیں، شاعری رقص کرتی ہے، اظہار و ابلاغ رقص کرتا ہے۔ غرض ان میں رقص ہی رقص ہے۔ اَن اَن گنت عناصر کا رقص جس کے مجموعی امتزاج سے فن اور جمالیاتی اظہار کی تشکیل ہوتی ہے۔

اور رقص کے اس آہنگ کو غالب کی اس ذہنی اور جذباتی کیفیت نے تخلیق کیا ہے جو ان کے فن اور جمالیاتی اظہار کا منبع اور مخرج ہے۔

غالب، جیسا کہ پہلے بھی واضح کیا گیا ہے، خیال اور جمالیاتی اظہار، مواد اور فن کی ہم آہنگی کے فن کار ہیں۔ غزلوں کے لئے مختلف زمینوں کا انتخاب بھی انہوں نے اسی ہم آہنگی کے شعور کے زیرِ اثر کیا ہے۔ چنانچہ اسی ہم آہنگی کے شعور کا یہ نتیجہ ہے کہ انہوں نے آہنگ کی مخصوص کیفیت کی ترجمانی کے لئے بعض ایسی زمینوں کو استعمال کرنے کا تجربہ کیا ہے جو اردو شاعری کی روایت میں بہت عام نہیں ہیں لیکن غالب نے تجربے کے خاص آہنگ کی ترجمانی کے لئے ان زمینوں کو استعمال کیا ہے، بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہے کہ ان کی تخلیق کی ہے۔ یہ زمینیں عام طور پر مُروّج نہیں ہیں۔ لیکن غالب نے ان کو کسی خاص کیفیت کو ظاہر کرنے کے لئے رواج دیا۔ ان زمینوں کا وزن و آہنگ دیکھئے ؎

تم اپنے شکوے کی باتیں نہ کھود کھود کر پوچھو
حذر کرو مرے دِل سے کہ اس میں آگ دبی ہے

دلا یہ درد و الم بھی تو مغتنم ہے کہ آخر
نہ گریۂ سحری ہے نہ آہ نیم شبی ہے

عجب نشاط سے جلاد کے چلے ہیں ہم آگے
کہ اپنے سائے سے سر پاؤں سے ہے دو قدم آگے

قضا نے تھا مجھے چاہا خراب بادۂ اُلفت
فقط خراب لکھا بس نہ چل سکا قلم آگے

غمِ زمانہ نے جھاڑی نشاطِ عشق کی مستی!
وگرنہ ہم بھی اُٹھاتے تھے لذّتِ الم آگے

خدا کے واسطے داد اس جنونِ شوق کو دینا
کہ اس کے در پہ پہنچتے ہیں نامہ بر سے ہم آگے

یہ عمر بھر جو پریشانیاں اٹھائی ہیں ہم نے
تمہارے آئیو اے طُرّہ ہائے خَم بہ خَم آگے

دل و جگر میں پر افشاں جو ایک موجۂ خوں ہے
ہم اپنے زعم میں سمجھے ہوئے تھے اس کو دم آگے

قسم جنازے پہ آنے کی میرے کھاتے ہیں غالب
ہمیشہ کھاتے تھے جو میری جان کی قسم آگے

ان غزلوں میں جو مخصوص آہنگ ہے اس سے واقعی یہ محسوس ہوتا ہے کہ شکوے کی باتیں کوئی کھود کر پوچھ رہا ہے جیسے واقعی کسی کے دل میں آگ دبی ہے۔ جیسے واقعی کوئی درد والم کو مغتنم تصوّر کر رہا ہے۔ جیسے واقعی گریہ سحری اور آہ نیم شبی کی کیفیت باقی نہیں رہی ہے۔ دوسری غزل میں مختلف اشعار اگرچہ مختلف موضوعات کو پیش کر رہے ہیں لیکن مجموعی طور پر بحر کا نیا آہنگ ان میں سے ہر موضوع کی صحیح کیفیت کو ظاہر

کر دیتا ہے اور یوں محسوس ہوتا ہے کہ غالب نے نئی زمین کا آہنگ اسی کیفیت کو ظاہر کرنے کے لئے تخلیق کیا۔ بہرحال غالب نے نئے آہنگ کو پیدا کرنے کے لئے نئی زمینوں کو وجود میں لانے کے بعض تجربے بھی کئے۔ یہ تجربے موضوع اور فن کی مناسبت اور ہم آہنگی کو نمایاں کرنے کے سلسلے میں خاصی اہمیت رکھتے ہیں۔ غالب نے ان کے ذریعے سے ایک نئے آہنگ کو وجود میں لاکر ایک اہم فنی کارنامہ انجام دیا ہے۔

ردیف و قوافی کے صحیح اور متناسب استعمال نے بھی غالب کی غزلوں کے مخصوص وزن و آہنگ کی تخلیق میں نمایاں کام کیا ہے۔ غالب ردیف یا قوافی کے سہارے شاعری نہیں کرتے بلکہ شاعری کے سہارے ردیف و قوافی کو تخلیق کرتے ہیں۔ غزل کے فن میں ردیف و قوافی کی تخلیق شاعر کا بڑا کارنامہ ہے۔ غزل کا فن ایسا ہے کہ بعض شاعر اپنے آپ کو صرف قافیہ پیمائی تک محدود کر لیتے ہیں۔ چنانچہ شاعری اور اس کا فن تو اس کا ساتھ چھوڑ دیتا ہے اور اس کی جگہ ان کے یہاں صرف قافیہ پیمائی رہ جاتی ہے۔ غالب کی شاعری، ظاہر ہے کہ قافیہ پیمائی نہیں ہے۔ وہ شاعر ہیں اس لئے ردیف و قوافی کا استعمال انہوں نے ایک شاعر کی حیثیت سے کیا ہے۔ اور ان کے فنکارانہ شعور نے ردیف و قوافی کے اس استعمال میں بڑے پہلو پیدا کئے ہیں، اور اس کو ایک فن بنا دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ غالب کی شاعری میں ردیف و قوافی کے استعمال کی فنی حیثیت پڑھنے والے کو قدم قدم پر اپنی طرف متوجہ کرتی ہے۔ غالب ان کے استعمال سے اپنے فن میں وزن و آہنگ کی نئی دنیائیں پیدا کرتے ہیں۔ ان سے ان کا آہنگ زیادہ زور دار ہو جاتا ہے۔ اس میں زیادہ جان

پیدا ہو جاتی ہے۔ زیادہ مترنم کیفیت کا وجود ہوتا ہے۔ زیادہ موسیقیت اور نغمگی کے پہلو نمایاں ہوتے ہیں اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اُن کی وجہ سے معنویت کا اظہار زیادہ پہلودار طریقے سے ہوتا ہے۔ غالب کی یہ غزلیں ردیف و قوافی کے مناسب اور متناسب استعمال کی بہترین مثالیں ہیں۔

دِل مرا سوزِ نہاں سے بے محابا جل گیا
آتشِ خاموش کی مانند گویا جل گیا

ستائش گر ہے زاہد جس قدر اس باغِ رضواں کا
وہ اک گلدستہ ہے ہم بے خودوں کے طاقِ نسیاں کا
کیا آئینہ خانے کا وہ نقشہ تیرے جلوے نے
کرے جو پرتوِ خورشید عالم شبستاں کا
نظر میں ہے ہماری جادۂ راہِ فنا غالب
کہ یہ شیرازہ ہے عالم اجزائے پریشاں کا

دوست غم خواری میں میری سعی فرمائیں گے کیا
زخم کے بڑھنے تلک ناخن نہ بڑھ جائیں گے کیا

ہوس کو ہے نشاطِ کار کیا کیا
نہ ہو مرنا تو جینے کا مزہ کیا

دردِ منت کشِ دوا نہ ہوا
میں نہ اچھا ہوا بُرا نہ ہوا

میں اور بزمِ مے سے تشنہ کام آؤں
گر میں نے کی تھی توبہ ساقی کو کیا ہوا تھا

ہوئی مدّت کہ غالب مرگیا پر یاد آتا ہے
وہ ہر اک بات پر کہنا کہ یوں ہوتا تو کیا ہوتا

جَور سے باز آئے پر باز آئیں کیا
کہتے ہیں ہم تجھ کو مُنہ دکھلائیں کیا

حُسن غمزے کی کَشاکَش سے چھُٹا میرے بعد
بارے آرام سے ہیں اہلِ جفا میرے بعد

ہے بس کہ ہر اک ان کے اشارے میں نشاں اور
کرتے ہیں محبت تو گذرتا ہے گماں اور

رخِ نگار سے ہے سوزِ جاودانیٔ شمع
ہوئی ہے آتشِ گل آبِ زندگانیٔ شمع

آہ کو چاہیے اک عمر اثر ہونے تک
کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک

ہے کس قدر ہلاکِ فریبِ وفائے گل
بلبل کے کاروبار پہ ہیں خندہ ہائے گل

غم نہیں ہوتا ہے آزادوں کو بیش از یک نفس
برق سے کرتے ہیں روشن شمعِ ماتم خانہ ہم

وہ فراق اور وہ وصال کہاں
وہ شب و روز و ماہ و سال کہاں

مہرباں ہو کے بلا لو مجھے چاہو جس وقت
میں گیا وقت نہیں ہوں کہ پھر آ بھی نہ سکوں

ہم سے کھل جاؤ بہ وقتِ مے پرستی ایک دن
ورنہ ہم چھیڑیں گے رکھ کر عذرِ مستی ایک دن

تیرے توسن کو صبا باندھتے ہیں
ہم بھی مضمون کی ہوا باندھتے ہیں

دائم پڑا ہوا ترے در پر نہیں ہوں میں
خاک ایسی زندگی پہ کہ پتھر نہیں ہوں میں

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہوگئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہوگئیں

وارستہ اس سے ہیں کہ محبت ہی کیوں نہ ہو
کیجئے ہمارے ساتھ عداوت ہی کیوں نہ ہو

گئی وہ بات کہ ہو گفتگو تو کیوں کر ہو
کہے سے کچھ نہ ہوا پھر کہو تو کیوں کر ہو

کسی کو دے کے دل کوئی نواسنج فغاں کیوں ہو
نہ ہو جب دل ہی پہلو میں تو پھر منہ میں زباں کیوں ہو

بساطِ عجز میں تھا ایک دل یک قطرہ خوں وہ بھی
سو رہتا ہے بہ اندازِ چکیدن سرنگوں وہ بھی

درد سے میرے ہے تجھ کو بیقراری ہائے ہائے
کیا ہوئی ظالم تری غفلت شعاری ہائے ہائے

عشق مجھ کو نہیں وحشت ہی سہی
میری وحشت تری شہرت ہی سہی

دیکھنا قسمت کہ آپ اپنے پہ رشک آجائے ہے
میں اسے دیکھوں بھلا کب مجھ سے دیکھا جائے ہے

کوئی دِن گر زندگانی اور ہے
اپنے جی میں ہم نے ٹھانی اور ہے

دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے
آخر اس درد کی دوا کیا ہے

پھر کچھ اک دِل کو بے قراری ہے
سینہ جویائے زخم کاری ہے

نہ ہوئی گر مرے مرنے سے تسلّی نہ سہی
امتحان اور بھی باقی ہیں تو یہ بھی نہ سہی

ہر ایک بات پہ کہتے ہو تم کہ تو کیا ہے
تمہیں کہو کہ یہ اندازِ گفتگو کیا ہے

کب وہ سنتا ہے کہانی میری
اور پھر وہ بھی زبانی میری

نکتہ چیں ہے غمِ دل اس کو سنائے نہ بنے
کیا بنے بات جہاں بات بنائے نہ بنے

دیا ہے دِل اگر اس کو بشر ہے کیا کہیے
ہوا رقیب تو ہو نامہ بَر ہے کیا کہیے

کبھی نیکی بھی اس کے جی میں گر آ جائے ہے مجھ سے
جفائیں کر کے اپنی یاد شرما جائے ہے مجھ سے

بازیچۂ اطفال ہے دنیا مرے آگے
ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے

کہوں جو حال تو کہتے ہو مُدعا کہیے
تمہیں کہو کہ جو تم یوں کہو تو کیا کہیے

بہت سہی غمِ گیتی شراب کم کیا ہے
غلامِ ساقیٔ کوثر ہوں مجھ کو غم کیا ہے

مُدّت ہوئی ہے یار کو مہماں کئے ہوئے
جوشِ قدح سے بزم چراغاں کئے ہوئے

یہاں غالب کی مختلف غزلوں سے صرف ایک ایک شعر نقل کیا گیا ہے۔ صرف اس خیال سے کہ ان کی غزلوں میں ردیف و قوافی کے استعمال کی فنی حیثیت کی وضاحت ہو جائے۔ ورنہ حقیقت تو یہ ہے کہ غالب کے یہاں ردیف کے ساتھ ہر شعر میں جو قافیہ استعمال ہوتا ہے وہ ایک نئے آہنگ کو پیدا کر دیتا ہے۔ لیکن جو اشعار اوپر نقل کئے گئے ہیں ان سے غالب کی شاعری میں ردیف و قوافی کے استعمال کی فن کارانہ اہمیت واضح ضرور ہو جاتی ہے۔ غالب کے ردیف و قوافی بے محابا جل گیا، گویا جل گیا، باغ رضوان کا، طاق نسیان کا، شبستان کا اجزائے پریشاں کا، فرمائیں گے کیا، بڑھ آئیں گے کیا، نشاط کار کیا کیا، جینے کا مزہ کیا، دوا نہ ہوا، برا نہ ہو، ساقی کو کیا ہوا تھا، کہ یوں ہوتا تو کیا ہوتا، باز آئیں کیا، دکھلائیں کیا، چھٹا مرے بعد، اہل جفا مرے بعد، نشاں اور، گماں اور، جادوائی شمع، کامرانیٔ شمع، اثر ہونے تک، سر ہونے تک، ہوائے گل، خندہ ہائے گل، ماتم خانہ ہم وصال کہاں، ماہ و سال کہاں، آ بھی نہ سکوں، مے پرستی ایک دن، عذر مستی ایک دن، صبا باندھتے ہیں، ہوا باندھتے ہیں، در پر نہیں ہوں میں، پتھر نہیں ہوں میں، نمایاں ہو گئیں، پنہاں ہو گئیں، محبت ہی کیوں نہ ہو، عداوت ہی کیوں نہ ہو، ہو گفتگو تو کیونکر ہو، کہو تو کیونکر ہو، فغان کیوں ہو، زبان کیوں ہو، خون وہ بھی، سرنگوں وہ

بھی، بے قراری ہائے ہائے، غفلت شعاری ہائے ہائے، وحشت ہی سہی، شہرت ہی سہی، آ جائے ہے، دیکھا جائے ہے، زندگانی اور ہے، ٹھانی اور ہے، ہوا کیا ہے، دوا کیا ہے، بیقراری ہے۔ زخم کاری ہے، تسلّی نہ سہی، یہ بھی نہ سہی، تو کیا ہے گفتگو کیا ہے، کہانی میری زبانی میری سناتے نہ بنے، بناتے نہ بنے، بشر ہے کیا کہئے، نامہ بر ہے کیا کہئے، آ جائے ہے مجھ سے، شرما جائے ہے مجھ سے، دُنیا میرے آگے، تماشا مرے آگے، مدعا کہئے، کیا کہئے، کم کیا ہے، مہماں کئے ہوئے، چراغاں کئے ہوئے، جس آہنگ کو پیدا کرتے ہیں، اس کو صرف محسوس ہی کیا جا سکتا ہے۔ ان کی ردیفیں بہ ذات خود بھی اہم ہیں اور ان میں بھی ایک نغمگی اور موسیقیت پائی جاتی ہے لیکن قوافی کے ساتھ ہم آہنگ ہو کر تو ان کی موسیقیت اور نغمگی میں کچھ اور بھی اضافہ ہو جاتا ہے اور ان کے صوتی آہنگ کا اثر براہِ راست حواس پر ہوتا ہے۔ غالب اس اعتبار سے ایک منفرد فنکار اور ایک بہت بڑے خالقِ جمال ہیں۔

غرض غالب کے فن میں وزن و آہنگ کی مختلف صورتوں کو بھی نمایاں مقام حاصل ہے۔ انہوں نے اس وزن و آہنگ کو جمالیاتی اظہار کا ذریعہ اور وسیلہ بنایا ہے۔ انہوں نے موضوع اور مواد کی مناسبت سے اس وزن و آہنگ کی تشکیل کی ہے اور اس سلسلے میں بحروں کا مناسب انتخاب

الفاظ، ترکیبوں، فقروں اور جملوں کی متناسب تراش خراش، ردیف و قوافی کا نغمگی اور موسیقیت سے بھرپور استعمال خاص طور پر ان کے پیشِ نظر رہا ہے اور ان سب کے مجموعی امتزاج سے وہ ایک ایسے وزن و آہنگ کی تشکیل میں کامیاب ہوئے ہیں جو ان کے جمالیاتی اظہار میں نمایاں حیثیت رکھتا ہے اور ان کے فن کا نہایت ہی اہم حصّہ ہے۔

روایت کے اثرات

غالب اپنے مزاج اور اُفتادِ طبع کے اعتبار سے ایک باغی فن کار ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے اپنے فن میں بعض جدّتیں بھی کی ہیں۔ روایت سے بغاوت کے اثرات بھی ان کے فن میں نظر آتے ہیں لیکن ان تمام باتوں کے باوجود روایت کے اثرات ان کے فن پر بڑے گہرے ہیں۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہے کہ ان کے فن کی جڑیں روایت کی زمین میں دُور دُور تک پھیلی ہوئی ہیں اور ان کے فن کا تناور درخت اسی روایت کی زمین سے کسبِ حیات کرتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ فضا میں پھیل کر فضا میں پرورش پانے والی گرمی اور روشنی کے ہاتھوں اس میں نئی نئی کونپلیں بھی پھوٹتی ہیں۔

اس سے قبل اس حقیقت کی وضاحت کی جاچکی ہے کہ غالب ایک تہذیب کی پیداوار تھے اور اس تہذیب کی روایت کو انھوں

پوری طرح اپنی شخصیت میں جذب کر لیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے فن اور جمالیاتی اظہار میں بھی اُس فنّی روایت کا عکس نظر آتا ہے جس کی تشکیل کئی سو سال میں اس تہذیبی روایت نے کی تھی۔ غالبؔ اس تہذیب کے انحطاط و زوال کے زمانے کی پیداوار ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے یہاں اس تہذیب اور اس کی فنی روایت کی اہمیّت کا احساس کچھ زیادہ ہی شدید نظر آتا ہے۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ غالبؔ اس فنی روایت کے معاملے میں کچھ زیادہ ہی حسّاس ہیں۔ اسی لیے اس روایت کی اہمیّت کا احساس اور اس کی پاسداری کا خیال ان کے یہاں کچھ زیادہ ہی نمایاں دکھائی دیتا ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ اُن کے فن میں اس فنی روایت کے علم برداروں کے اثرات جگہ جگہ اپنی جھلک دکھاتے ہیں۔ اور ساتھ ہی اس فنّی روایت کی جو صورت، مختلف ارتقائی منازل طے کرکے ان تک پہنچی ہے، اس کا اثر بھی ان کے فن میں نمایاں نظر آتا ہے۔

غالبؔ کے فن پر فارسی کی فنّی روایت اور بعض فارسی شعراء کے فنّی اثرات، ان کی زندگی کے ہر دور میں پڑتے رہے ہیں۔ خاص طور پر ان کے فن کا ابتدائی زمانہ فارسی کی اس شعری اور فنی روایت کے اثر کا زمانہ ہے جس کا سلسلہ اکبر اعظم کے عہد سے شروع ہوتا ہے۔ اور اورنگ زیبؒ عالمگیر کے عہد تک، بلکہ اس کے بھی بعد تک جاری رہتا ہے۔ اس کے علم بردار ایک طرف فیضیؔ، عرفیؔ، نظیریؔ اور ظہوریؔ نظر آتے ہیں اور دوسری طرف بیدلؔ، ناصر علی، صائبؔ اور اسیرؔ وغیرہ ...... اوّل الذکر فارسی شعراء کے یہاں اس فنی روایت

کی جو مثال ملتی ہے اس میں خیال آفرینی، رنگینی، پُرکاری اور ایک لطیف رمزیت کے عناصر نمایاں ہیں اور آخرالذکر کے یہاں خیال کی بلندی، معانی کی پیچیدگی، زبان میں ایک ترشی ہوئی کیفیت اور اظہار میں ایک ابہام کی کیفیت نمایاں دکھائی دیتی ہے۔ غالب سے قبل اردو شاعری کا ایک دور ایسا گذر چکا تھا جس کے علمبردار میرؔ، سوداؔ اور دردؔ تھے۔ اور جنہوں نے فارسی کی اس روایت کی دونوں صورتوں کے امتزاج سے ایک نئی روایت کی تشکیل کی تھی جس میں سادگی، روانی اور لطیف رمز و ایما کے عناصر زیادہ نمایاں تھے۔ غالب کے فن میں ان تینوں کا اثر ملتا ہے۔ ابتدائی زمانے میں وہ بیدلؔ کی روایت سے زیادہ متاثر تھے۔ درمیانی دور میں ظہوریؔ، عرفیؔ، اور نظیریؔ کی روایت کے اثرات اس اثر میں مل جُل گئے اور آخری دور میں میرؔ و سوداؔ کی روایت کے اثرات بھی اس میں شامل ہو گئے۔ غالب کے فن میں شعری روایت کی ان مختلف صورتوں کا ایک حسین سنگم ملتا ہے۔

یہ بات اس سے قبل بھی کہی جا چکی ہے کہ غالب کا زمانہ فنی اجتہاد کا زمانہ تھا اور اس فنی اجتہاد کے عوامل و محرکات، اس زمانے کے وہ سیاسی، معاشرتی، تہذیبی اور فکری حالات تھے جنہوں نے اس وقت کی زندگی کا نقشہ ہی بدل دیا تھا۔ غالبؔ اور اُن کے ہمعصروں کے فن میں جو ایک نیا رنگ و آہنگ نظر آتا ہے اس کی بنیادی وجہ یہی ہے۔ ان سب نے اپنے دائرے میں رہ کر فنی روایت میں ایک اجتہادی شان پیدا کی ہے۔ غالب بھی اس کام میں ہمیشہ

پیش پیش رہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے فن میں ان سے قبل کی فنی روایت بعض نئی صورتیں بھی اختیار کرتی ہے لیکن ان صورتوں میں کوئی انقلابی رنگ و آہنگ نظر نہیں آتا۔ بلکہ مروجہ روایت کو نئے حالات سے ہم آہنگ کرکے ایک نئی شکل دینے اور اس کو زیادہ سے زیادہ نکھارنے اور سنوارنے کی طرف توجہ دکھائی دیتی ہے۔ غالبؔ کا فن اس اعتبار سے منفرد ہے۔ کیونکہ انھوں نے اسی روایت میں زیادہ ترشی ہوئی کیفیت پیدا کر دی ہے۔ اور یہ ان کا بہت بڑا فنی کارنامہ ہے۔

اس کی مثالیں تو غالبؔ کی شاعری اور اُن کے فن میں ہر جگہ نظر آتی ہیں لیکن اپنے بعض اشعار میں کچھ نظریاتی اور اصولی باتیں انھوں نے ایسی کہی ہیں جن کو سامنے رکھا جائے تو غالبؔ نے روایت کا جو اثر قبول کیا ہے اور اس میں ایک اجتہادی شان پیدا کرکے اس کو جو ایک نئی صورت دی ہے، اس کی صحیح تصویر آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے۔ یہ اشعار ان کے نظریات کے صحیح ترجمان ہیں

لکھتا ہوں اسدؔ سوزشِ دل سے سخنِ گرم
تا رکھ نہ سکے کوئی مرے حرف پہ انگشت

وہی اک بات ہے جو یاں نفس واں نکہتِ گُل ہے
چمن کا جلوہ باعث ہے مری رنگین نوائی کا

تازہ نہیں ہے نشۂ فکرِ سُخن مجھے
تریاکیٔ قدیم ہوں دودِ چراغ کا

ہوں گرمیٔ نشاطِ تصوّر سے نغمہ سنج
میں عندلیبِ گُلشنِ نا آفریدہ ہوں

آتے ہیں غیب سے یہ مضامین خیال میں
غالب صریرِ خامہ نوائے سروش ہے

پاتا ہوں داد اس سے کچھ اپنے سخن کی میں
روح القدس اگرچہ مرا ہم زباں نہیں

میں جو گُستاخ ہوں آئینِ غزل خوانی میں
یہ بھی تیرا ہی کرم ذوقِ فزا ہوتا ہے

نہ ستائش کی تمنّا نہ صِلے کی پروا
گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی نہ سہی

آگہی دامِ شُنیدن جس قدر چاہے بچھائے
مدّعا عنقا ہے اپنے عالمِ تقریر کا

حسن فروغِ شمعِ سخن دور ہے اسدؔ
پہلے دلِ گداختہ پیدا کرے کوئی

کھلتا کسی پہ کیوں مرے دل کا معاملہ
شعروں کے انتخاب نے رسوا کیا مجھے

نغمہ ہائے غم کو ہی اے دل غنیمت جانیے
بے صدا ہو جائے گا یہ سازِ ہستی ایک دن

فریاد کی کوئی لے نہیں ہے
نالہ پابندِ نے نہیں ہے

یہ غزل اپنی مجھے جی سے پسند آئی ہے آپ
ہے ردیفِ شعر میں غالبؔ ز بس تکرار دوست

کچھ تو کہیے کہ لوگ کہتے ہیں
آج غالبؔ غزل سرا نہ ہوا

ہمارے شعر ہیں اب صرف دل لگی کے اسدؔ
کھلا کہ فائدہ عرضِ ہنر میں خاک نہیں

ہیں اور بھی دُنیا میں سخنور بہت اچھے
کہتے ہیں کہ غالبؔ کا ہے اندازِ بیاں اور

ادائے خاص سے غالبؔ ہوا ہے نکتہ سرا
صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لئے

جو یہ کہے کہ ریختہ کیونکہ ہو رشکِ فارسی
گفتۂ غالب ایک بار پڑھ کے اسے سُنا کہ یوں

بقدرِ شوق نہیں ظرف تنگنائے غزل
کچھ اور چاہیے وسعت مری زباں کے لیے

مقصد ہے ناز و غمزہ ولے گفتگو میں کام
چلتا نہیں ہے دشنۂ خنجر کہے بغیر

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو
بنتی نہیں ہے بادۂ و ساغر کہے بغیر

یہ اشعار، بغیر کسی ترتیب کے، صرف یادداشت کے سہارے یہاں نقل کئے گئے ہیں - ان کو پڑھ کر جو نتائج نکلتے ہیں وہ یہ ہیں کہ غالب نے سوزشِ دل سے سخن گرم کی تخلیق کی ہے - ان کی

نغمہ سنجی گرمیٔ نشاطِ تصوّر کی مرہونِ منت ہے - ان کا دل گداختہ ان کی شاعری کا منبع ہے - ان کا اندازِ بیان منفرد ہے اور وہ ایک ادائے خاص سے نکتہ سرا ہوئے ہیں - انہوں نے ریختے کو رشک فارسی بنا دیا ہے - ظرف تنگنائے غزل ان کے لئے کافی نہیں - ان کی زبان کے لئے تو کچھ اور وسعتیں درکار ہیں، انہوں نے نازو غمزہ کی گفتگو دشنۂ و خنجر میں اور مشاہدۂ حق کی گفتگو، بادہ و ساغر میں کی ہے۔ اور ان سب باتوں کا مطلب یہ ہے کہ انہوں نے شاعری اور فن کی مروجہ روایت سے استفادہ کیا ہے اور اس کو نئے تصوّرات اور نئے اسالیب سے آشنا کرنے کی کوشش بھی کی ہے - ان کا جمالیاتی اظہار اور فن اس صورت حال کی پوری طرح عکّاسی کرتا ہے۔

غالب غزل کے فن کار ہیں اور غزل کی کئی سو سال کی فنّی روایت کو انہوں نے اپنے فن میں بڑے سلیقے سے برتا ہے - غالب جہاں تک ان کے خیالات و نظریات کا تعلّق ہے، ایک انقلابی ہیں - ان کا احساس نیا ہے - ان کے خیالات میں جدّت ہے - ان کے نظریات بھی نئے ہیں۔ لیکن ان سب کا اظہار انہوں نے اس طرح کیا ہے کہ غزل کی روایات کو ان کی شاعری میں ٹھیس نہیں لگتی - عشقیہ فضا، غزل کی روایت کی بنیاد ہے - غالب نے اس عشقیہ فضا کو اپنے فن میں برقرار رکھا ہے - حسن کی کیفیت، محبوب کے حسن کا عالم، اس کے ساتھ عاشق کے روابط، اور پھر ان روابط کے نتیجے میں عاشق کی حالت - ان سب کی تفصیل غالب نے اسی انداز میں پیش کی ہے جو غزل کا مخصوص انداز ہے اور جس کو اس روایت کے علم برداروں نے ہر دور میں برتا ہے - عاشق کا محبوب سے متاثر ہونا، اسکے کوچے میں جانا لیکن اسکے دیدار کا نصیب نہ ہونا، رقیب کا عاشق

کے راستے میں حائل ہونا، اس کے کوچے میں جانا لیکن اس کے دیدار کا نصیب نہ ہونا، رقیب کا عاشق کے راستے میں حائل ہونا عاشق کا رشک سے مرنا، ناصح کا نصیحت کرنا لیکن عاشق کا اس نصیحت کو درخور اعتنا نہ سمجھنا، نامہ بر کے ہاتھوں نامہ و پیام کا سلسلہ جاری رکھنا لیکن ناکام ہونا اور پھر صحرا کی طرف بھاگنا اور بالآخر فنا ہو جانا — یہ اور اس قسم کی بے شمار باتیں غالب نے اپنی شاعری میں غزل کی روایت کے سہارے پیش کی ہیں۔ اور اس طرح غزل کے فنی تقاضوں کو پورا کیا ہے۔ یہ اشعار اُن کے اس فنی میلان کی صحیح ترجمانی کرتے ہیں۔

؎ حالِ دل نہیں معلوم لیکن اس قدر یعنی
ہم نے بارہا ڈھونڈا۔ تم نے بارہا پایا

—

شورِ پندِ ناصح نے زخم پر نمک چھڑکا
آپ سے کوئی پوچھے تم نے کیا مزا پایا

—

احباب چارہ سازیٔ وحشت نہ کر سکے
زنداں میں بھی خیال بیاباں نورد تھا

—

یہ لاشِ بے کفن اسدؔ خستہ جاں کی ہے
حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

—

سبزۂ خط سے ترا کاکُل سرکش نہ دبا
یہ زمرّد بھی حریفِ دمِ افعی نہ ہوا
میں نے چاہا تھا کہ اندوہِ وفا سے چھوٹوں
وہ ستمگر مرے مرنے پہ بھی راضی نہ ہوا

بغل میں غیر کی آپ آج سوئے ہیں کہیں ورنہ
سبب کیا خواب میں آکر تبسّم ہائے پنہاں کا

در پہ رہنے کو کہا اور کہہ کے کیا پھر گیا
جتنے عرصے میں مرا لپٹا ہوا بستر کھلا

گلیوں میں میری نعش کو کھینچے پھرو کہ میں
جاں دادۂ ہوائے سرِ رہگذار تھا

حضرتِ ناصح گر آئیں دیدہ و دل فرشِ راہ
کوئی مجھ کو یہ تو سمجھا دو کہ سمجھائیں گے کیا
آج واں تیغ و کفن باندھے ہوئے جاتا ہوں میں
عذر میرے قتل کرنے میں وہ اب لائیں گے کیا

گر کیا ناصح نے ہم کو قید اچھا یوں سہی
یہ جنونِ عشق کے انداز چھٹ جائیں گے کیا

یہ کہاں کی دوستی ہے کہ بنے ہیں دوست ناصح
کوئی چارہ ساز ہوتا کوئی غمگسار ہوتا

لے تو لوں سوتے میں اُس کے پاؤں کا بوسہ مگر
ایسی باتوں سے وہ کافر بدگماں ہو جائے گا

جمع کرتے ہو کیوں رقیبوں کو
اک تماشا ہوا گلہ نہ ہوا

کتنے شیریں ہیں تیرے لب کہ رقیب
گالیاں کھا کے بدمزا نہ ہوا

پھر ترے کوچے کو جاتا ہے خیال
دلِ گم گشتہ مگر یاد آیا
میں نے مجنوں پہ لڑکپن میں اسدؔ
سنگ اُٹھایا تھا کہ سر یاد آیا

رشک کہتا ہے کہ اُس کا غیر سے اخلاص حیف
عقل کہتی ہے کہ وہ بے مہر کس کا آشنا

موجِ خون سر سے گذر ہی کیوں نہ جائے
آستانِ یار سے اُٹھ جائیں کیا
پوچھتے ہیں وہ کہ غالب کون ہے
کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا

آئے ہے بے کسیٔ عشق پہ رونا غالبؔ
کس کے گھر جائے گا سیلابِ بلا میرے بعد

سر پھوڑنا وہ غالبِ شوریدہ حال کا
یاد آگیا مجھے تری دیوار دیکھ کر

نہ لڑ ناصح سے غالب کیا ہوا گر اس نے شدّت کی
ہمارا بھی تو آخر زور چلتا ہے گریبان پر

ہوں گرفتارِ الفتِ صیّاد
ورنہ باقی ہے طاقتِ پرواز

دَھول دھپّا اُس سراپا ناز کا شیوہ نہیں
ہم ہی کر بیٹھے تھے غالب پیش دستی ایک دن

قاصد کے آتے آتے خط اک اور لکھ رکھوں
میں جانتا ہوں جو وہ لکھیں گے جواب میں

مجھ تک کب ان کی بزم میں آیا تھا دورِ جام
ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں

خدا شرمائے ہاتھوں کو کہ رکھتے ہیں کشاکش میں
کبھی میرے گریباں کو کبھی جاناں کے دامن کو

رہے اس شوخ سے آزردہ ہم چندے تکلف سے
تکلّف برطرف تھا ایک اندازِ جنوں وہ بھی

یار سے چھیڑ چلی جائے اسدؔ
گر نہیں وصل تو حسرت ہی سہی

سادگی پر اُس کی مر جانے کی حسرت دل میں ہے
بس نہیں چلتا کہ پھر خنجر کفِ قاتل میں ہے

ان اشعار میں غزل کی روایت کا صحیح مزاج ملتا ہے۔ یہ سب کے سب کاروبارِ شوق کے اُنہیں پہلوؤں کے ترجمان اور عکاس ہیں جن کو غزل کی روایت ایک مخصوص انداز میں پیش کرتی ہے۔ ان میں مجموعی طور پر ایک مخصوص فضا ہے جس کو غزل کی روایت بہر صورت اپنے

پیشِ نظر رکھتی ہے - ان میں کہیں عاشق کا دِل گم ہوتا ہے، کہیں ناصح اپنی نصیحت سے اس کے زخموں پر نمک چھڑکتا ہے لیکن اس کے باوجود عاشق محبوب کے کوچے میں جاتا ہے، اس کی دیوار کے سائے تلے بیٹھتا ہے بلکہ اس سے سر پھوڑتا ہے۔ رقیبوں سے اس کی نوک جھونک رہتی ہے - غیروں کا وہ شکوہ کرتا ہے۔ لیکن محبوب اس شکوے پر کان نہیں دھرتا - وہ غیر کی بغل میں سوتا ہے۔ عاشق اس کے دَر کے سامنے بستر لگاتا ہے۔ پاسباں اس کو آڑے ہاتھوں لیتا ہے لیکن وہ تو تیغ وکفن باندھ کر گھر سے نکلتا ہے تاکہ محبوب اس کو قتل کر دے۔ یہ اور اسی قسم کی دوسری باتیں جو ان اشعار میں بیان کی گئی ہیں ان میں غزل کی روایت کے اثرات صاف نمایاں ہیں۔ غالب نے اسی روایت کو اس طرح برتا ہے کہ ان کے یہاں صحیح معنوں میں تغزل کی شان پیدا ہو گئی ہے۔

اور غالب اس اعتبار سے ایک بہت بڑے فن کار ہیں۔ انھوں نے تو تصوّف اور فلسفہ کے موضوعات تک کو تغزّل کے سانچے میں ڈھال دیا ہے۔ اور مشاہدۂ حق کی گفتگو بادۂ و ساغر میں بڑے سلیقے سے کی ہے۔ ان کے فن کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ وہ اشاروں اور کنایوں میں نہ جانے کیا کیا کچھ کہہ جاتے ہیں۔ رمز و ایما کے پردے میں زندگی کے دقیق سے دقیق مسائل کو آسان بنا کر پیش کرتے ہیں۔ اس میں شُبہ نہیں کہ تصوّف کو تغزل کے رنگ میں پیش کرنے کی روایت فارسی اور اُردو دونوں میں بہت پرانی ہے۔ اس لئے غالب نے اس کو بَرت کر کوئی جدّت پیدا نہیں

کی - البتہ یہ ضرور ہے کہ انہوں نے اظہار و ابلاغ میں بعض نئے پہلو پیدا کیے - پرانی علامتوں میں نئی معنویت کو سمویا اور نئی معنویت کے لیے نئی علامتوں کی تخلیق بھی کی - اس طرح مجموعی طور پر انہوں نے تغزل کی روایت کو ایک نیا اسلوب بھی دیا - یہ چند اشعار اس نئے اسلوب کے بہترین نمونے ہیں ؎

؎ بقدرِ ظرف ہے ساقی خمارِ تشنہ کامی بھی
جو تو دریائے مے ہے تو میں خمیازہ ہوں ساحل کا

محرم نہیں ہے تو ہی نوا ہائے راز کا
یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا

جلوہ ازبس کہ تقاضائے نگہ کرتا ہے
جوہرِ آئینہ بھی چاہے ہے مژگاں ہونا

میں اور بزمِ مے سے یوں تشنہ کام آؤں
گر میں نے کی تھی توبہ ساقی کو کیا ہوا تھا

وا کر دیے ہیں شوق نے بندِ نقابِ حسن
غیر از نگاہ اب کوئی حائل نہیں رہا

بخشے ہے جلوۂ گُل ذوقِ تماشہ غالب
چشم کو چاہیئے ہر رنگ میں وا ہو جانا

ہے تجلی تری سامانِ وجود
ذرّہ بے پر تو خورشید نہیں

جب وہ جمالِ دلفروز صورتِ مہر نیم روز
آپ ہی ہو نظارہ سوز پردے میں منہ چھپائے کیوں

ان اشعار میں، جیسا کہ ان کے مفہوم سے ظاہر ہے، تصوف کی باتیں ہیں۔ غالب نے ایک مخصوص اسلوب سے ان میں تغزل کی شان پیدا کر دی ہے لیکن غالب نے اس انداز و اسلوب میں جمالیاتی اظہار کرکے کوئی ایسی جدت نہیں کی جو غزل کی روایت کے خلاف ہو۔ کیونکہ تغزل کے اسلوب میں مسائل تصوف کو پیش کرنے کی روایت غزل میں بہت پرانی ہے۔ غالب سے قبل فارسی اور اردو دونوں میں اس روایت کو بڑے سلیقے سے برتا گیا ہے۔ غالب نے اس روایت کو اپنے پیشِ نظر رکھا۔ البتہ اس کے جمالیاتی اظہار میں بعض جدتیں ضرور کیں۔ مثلاً "خمیازہ ہوں ساحل کا"۔ "جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا"۔ "جوہر آئینہ بھی چاہے ہے مژگاں ہونا"۔ "وا کر دیئے ہیں شوق نے بندِ نقابِ حسن"۔ "بخشے ہے جلوۂ گل ذوق تماشا غالب"۔ "ذرہ بے پر تو خورشید نہیں"، "جب وہ جمال دلفروز صورت مہر نیم روز"

ان سب میں ایسی جدت پائی جاتی ہے، جس سے غزل کی روایت اب تک نا آشنا تھی۔

یہ ساری بحث اس حقیقت کو واضح کرتی ہے کہ غالب نے روایت کو بڑے سلیقے سے برتا ہے اور جمالیاتی اظہار میں اس سے بڑے بڑے کام لئے ہیں لیکن روایت کو بعض ایسے پہلوؤں سے بھی ہمکنار کیا ہے کہ اس میں جدتیں پیدا ہو گئی ہیں۔ اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ غالب نے روایت کو پوری طرح تسلیم نہیں کیا ہے اور اس کے بعض پہلوؤں کو پسندیدگی کی نظر سے نہیں دیکھا ہے۔ مثلاً غزل کے بعض مضامین کے جمالیاتی اظہار کا روایتی انداز انہیں پسند نہیں ہے اس لئے ان کے کلام میں جب یہ مضامین آتے ہیں تو ان کے یہاں شوخی اور طنز و مزاح کا پہلو پیدا ہو جاتا ہے اور اس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ غالب کو یہ انداز بھاتا نہیں۔ اس لئے وہ اس کو پیش کرنے میں طنز سے کام لے رہے ہیں۔ بلکہ اس روایتی انداز کا مضحکہ اڑا رہے ہیں۔

غزل کی شاعری اس صورت کو برداشت نہیں کر سکتی کیونکہ وہ (جیسا کہ راقم نے آج سے چند سال قبل ایک مضمون میں لکھا تھا) سوز و گداز کی شاعری ہے اور شوخی کو گوارا نہیں کرتی۔ لیکن غالب کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے اس شوخی کو غزل کے لئے گوارا بنا دیا ہے اور وہ ان کی غزلوں کا ایک لازمی جزو نظر آتی ہے۔ اس شوخی کا پتہ ان کے یہاں حسن کے بیان میں بھی چلتا ہے۔ محبوب اور محبت کرنے والے کے جو روابط ہیں، اور ان کے نتیجے میں جو حالات

پیدا ہوتے ہیں، ان میں بھی اس کی جھلک نظر آتی ہے۔ عشق اور کاروبار شوق کی جو تفصیل انہوں نے پیش کی ہے اس میں بھی شوخی کا عنصر کارفرما دکھائی دیتا ہے۔ اس عشق کے جو نتائج نکلتے ہیں اور اس کا جو انجام ہوتا ہے، اس کی جزئیات میں بھی یہ شوخی اپنا اثر دکھاتی ہے۔ غرض غالب کسی جگہ بھی اس شوخی کو اپنے ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔ بلکہ اس سے خاطر خواہ کام لیتے ہیں۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ ان کے ایسا کرنے سے غزل کے کارگہِ شیشہ گری کو ٹھیس نہیں لگتی۔ یہ آبگینہ اس تندی صبا سے پگھلتا نہیں۔ اس کی آب وتاب پوری طرح باقی رہتی ہے۔ بلکہ اس میں جو شراب ہے اس کی مستی میں کچھ اور بھی اضافہ ہو جاتا ہے اور اس کے ظاہری رنگ میں کچھ اور بھی تیزی پیدا ہو جاتی ہے۔ اور ان دونوں چیزوں سے دل کو سرور اور آنکھوں کو نور ملتا ہے۔

لیکن غالب کے کلام میں یہ شوخی اسی جگہ اپنی انتہائی بلندیوں پر نظر آتی ہے جب وہ فن کے روایتی انداز پر براہِ راست یا بالواسطہ طنز و مزاح کے تیر و نشتر چلاتے ہیں۔ یہ اشعار ان کے فن کے اس رجحان کی ترجمانی کرتے ہیں۔

اس سادگی پہ کون نہ مر جائے اے خدا
لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں

ہے کیا جو کس کے باندھیے میری بلا ڈرے
کیا جانتا نہیں ہوں تمہاری کمر کو میں!

لاغر اتنا ہوں کہ گر تو بزم میں جا دے مجھے
میرا ذمّہ دیکھ کر گر کوئی بتلا دے مجھے

میں نے کہا کہ بزمِ ناز چاہیے غیر سے تہی
سُن کے ستم ظریف نے مجھ کو اُٹھا دیا کہ یُوں

گدا سمجھ کے وہ چُپ تھا جو مری شامت آئی
اٹھا اور اُٹھ کے قدم میں نے پاسباں کے لئے

دے وہ جس قدر ذلّت ہم ہنسی میں ٹالیں گے
بارے آشنا نکلا اُن کا پاسباں اپنا

دل ہی تو ہے سیاستِ درباں سے ڈر گیا
میں جاؤں اور دَر سے ترے بِن صدا کئے

در پہ رہنے کو کہا اور کہہ کے کیسا پھر گیا
جتنے عرصے میں مرا لپٹا ہوا بستر کھُلا

مگر لکھوائے کوئی اس کو خط تو ہم سے لکھوائے
ہوئی صبح اور گھر سے کان پر رکھ کر قلم نکلے

بوسہ دیتے نہیں اور دل پہ ہے ہر لحظہ نگاہ
جی میں کہتے ہیں کہ مفت آئے تو مال اچھا ہے

چاہتے ہیں خوب رویوں کو اسدؔ
آپ کی صورت تو دیکھا چاہئے

ان اشعار میں جو شوخی ہے۔ اس میں طنز و مزاح کا پہلو بہت نمایاں نظر آتا ہے۔ اور ان کے انداز سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ غالب نے غزل کے ان روایتی مضامین کو سنجیدگی کے ساتھ پیش نہیں کیا ہے۔ بلکہ وہ ان کے مضحکہ خیز پہلوؤں کو اُبھارنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ محبوب کا بغیر تلوار کے لڑنا اور محبت کرنے والے کا اس کی اس سادگی پر مرنا، محبوب کا کمر کو کس کے باندھنا لیکن محبت کرنے والے کا اس سے نہ ڈرنا، محبت کرنے والے کا اتنا لاغر ہو جانا کہ کوئی اس کو دیکھ کر بتلا نہ سکے، محبوب کا محبت کرنے والے کو بزم سے اُٹھا دینا، محبت کرنے والے کا محبوب کے کوچے میں جانا اور گدا سمجھ کے پاسبان کا اس کو آڑے ہاتھوں لینا، سیاست دربان سے دل کا ڈر جانا، محبوب کا محبت کرنے والے سے در پر رہنے کے لئے کہنا لیکن بستر کے کھُلتے ہی اس کا اپنے قول سے پھر جانا، محبت کرنے والے کا صبح کو کان پر قلم رکھ کر نکلنا تاکہ اسے خط لکھنے کا موقع ملے، محبوب کا بوسہ نہ دینا اور دل کو مفت کا مال سمجھ کر اس پر نگہ رکھنا، خوبرویوں کو چاہنا لیکن اپنی صورت کی بدصورتی کو محسوس نہ کرنا، یہ تمام

مضامین ایسے ہیں جو غزل کے روایتی مضامین ہیں۔ غالب کو ان کی بے کیفی کا احساس ہے۔ وہ ان کو پسند نہیں کرتے۔ اسی لئے انہوں نے طنز و مزاح کے رنگ میں ان کو پیش کیا ہے لیکن ان کے اس انداز نے ان کے فن میں ایک ایسا نیا پہلو پیدا کر دیا ہے جو اردو کے کسی دوسرے غزل گو شاعر کے یہاں نظر نہیں آتا۔

غرض روایت نے غالب کے فن میں کچھ ایسے پہلو پیدا کئے ہیں جو غزل کے فن کی روایت میں اضافہ ہیں۔ اور جن کی وجہ سے غالب کا فن نئے آسمانوں پر پرواز کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔

علامات واشارات

غالب کے فن میں جو چیز سب سے زیادہ اپنی طرف متوجہ کرتی ہے وہ علامتوں کا استعمال ہے۔ اُن کی شاعری علامتوں کا ایک مُرقع ہے۔ انہوں نے اَن گِنت علامتوں کو نئی زندگی دی ہے۔ وہ علامتوں کی اہمیت کے قائل ہیں انہوں نے اس کا اظہار بھی کیا ہے۔ جب وہ کہتے ہیں کہ مشاہدۂ حق کی گفتگو بادۂ وساغر میں اور ناز و غمزہ کی بات دشنۂ و خنجر میں ہونی چاہئے تو گویا شاعری میں علامتوں کی اہمیت کو واضح کرتے ہیں ؎

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو
بنتی نہیں ہے بادۂ و ساغر کہے بغیر
مقصد ہیں ناز و غمزہ ولے گفتگو میں کام
چلتا نہیں ہے دشنۂ و خنجر کہے بغیر

———

لیکن غالب کے اس بیان میں علامتوں کو صرف اظہار و ابلاغ کا ایک ذریعہ اور وسیلہ بتایا گیا ہے۔ اُن کی جذباتی اہمیت کی وضاحت نہیں کی گئی ہے۔ غالباً غالب اس کا شعور نہیں رکھتے تھے لیکن عملی طور پر انہوں نے اپنی شاعری میں علامتوں کو کسی جذبے کی ترجمانی کے لئے استعمال کیا ہے اور اس میں اُن کی کوئی شعوری کوشش شامل نہیں ہے۔ اُن کا جذباتی تجربہ ان علامتوں کو تخیل کرتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ وہ ان کے جمالیاتی اظہار میں بھی حسن آفرینی کا باعث بنتی ہیں۔ غالب خود اُنہیں شعوری طور پر اپنے جمالیاتی اظہار کے لئے تخلیق نہیں کرتے وہ تو ان کے تخلیقی مزاج کا ایک فطری عمل ہے۔

ڈبلیو۔ بی۔ ییٹس نے شاعری کی علامتوں کی اہمیت پر شاید سب سے اچھی نظریاتی بحث کی ہے اور عملی طور پر بھی اپنی شاعری میں ان اصول اور نظریات کو برتا ہے۔ ییٹس کا خیال ہے کہ علامتیں شاعری میں ایک بہت بڑی طاقت کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ان سے نہ صرف اس میں زور پیدا ہوتا ہے بلکہ وہ اس کو پہلودار بنا کر اس میں حسن بھی پیدا کر دیتی ہے۔

علامتوں کا مطلب ہے تجربات کا اظہار اس طریقے سے کریں کہ اس سے بہتر اظہار ممکن نہ ہو سکے۔ ان علامتوں کے سہارے یقیناً شاعر کے پیچیدہ تجربات کا اظہار بہتر طریقے سے صحیح طور پر حسین پیرائے میں ہوتا ہے۔ یہ علامتیں کہیں کہیں شاعر کے جمالیاتی اظہار کو مجموعی طور پر پیچیدہ بھی بنا دیتی ہے لیکن اس کی یہ پیچیدہ کیفیت تہہ داری تک محدود رہتی ہے اس لئے اس میں احساسِ جمال کی

تسکین کا بڑا سامان ہوتا ہے۔

غالبؔ نے بھی اپنے پیچیدہ اور تہہ در تہہ تجربات کے اظہار کیلئے علامتوں کو استعمال کیا ہے اور یہ علامتیں اُن کے یہاں ایک طاقت بن گئی ہیں ۔ ان علامتوں کی وجہ سے ان کے فن میں زندگی اور جولانی نظر آتی ہے اور جمالیاتی اظہار کے لئے ایک نئے انداز کا تجربہ ہوتا ہے ۔ اُردو غزل کی روایت میں شاید غالب پہلے فن کار ہیں جن کے یہاں علامتوں کا استعمال ایک باقاعدہ نظام کی صورت میں ملتا ہے اور اس اعتبار سے دیکھا جائے تو وہ پہلے باقاعدہ علامت نگار شاعر نظر آتے ہیں ۔ انہوں نے مُروّجہ علامتوں کو بھی استعمال کیا ہے اور ان کے جسم میں نیا خونِ زندگی دوڑا کر اُن سے بڑے بڑے کام لئے ہیں لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ انہوں نے بے شمار نئی علامتوں کی تخلیق بھی کی ہے ۔ ان نئی علامتوں کی تخلیق میں اُن کی کسی شعوری کوشش کو دخل نہیں ۔ ان کا وجود تو غالبؔ کے تہہ دار اور پیچیدہ تجربات کا مرہونِ منت ہے

غزل کی روایت میں جو مُروّجہ علامتیں موجود ہیں، اور جن کو غالبؔ سے قبل فارسی اور اردو غزل دونوں میں استعمال کیا گیا تھا، ان کو غالبؔ نے بڑے سلیقے سے استعمال کیا ہے اور ان میں زندگی کی ایک نئی لہر بھی دوڑا دی ہے ۔ نئے پہلو بھی ان میں نکالے ہیں اور کچھ نئی وسعتیں بھی ان میں پیدا کر دی ہیں ۔ یہ اشعار دیکھئے:-

دل گزرگاہِ خیالِ مے و ساغر ہی سہی
گر نفس جادۂ سر منزلِ تقویٰ نہ ہوا

محبت تھی چمن سے لیکن اب یہ بے دماغی ہے
کہ موجِ بوئے گُل سے ناک میں آتا ہے دم میرا

بقدرِ ظرف ہے ساقی خمارِ تشنہ کامی بھی
جو تُو دریائے مے ہے تو میں خمیازہ ہوں ساحل کا

جلوۂ گل نے کیا تھا واں چراغاں آب جو
یاں رواں مژگانِ چشمِ تر سے خونِ ناب تھا

آج واں تیغ و کفن باندھے ہوئے جاتا ہوں میں
عذر میرے قتل کرنے میں وہ اب لائیں گے کیا

گر کیا ناصح نے ہم کو قید اچھا یُوں سہی
یہ جنونِ عشق کے انداز چھٹ جائیں گے کیا

وُہی اک بات ہے جو یاں نفس واں نکہتِ گُل ہے
چمن کا جلوہ باعث ہے مری رنگیں نوائی کا

باغ میں مجھ کو نہ لے جا ورنہ میرے حال پر
ہر گُلِ تر ایک چشمِ خُوں فشاں ہو جائے گا

میں اور بزمِ مے سے یوں تشنہ کام آؤں
گر میں نے کی تھی توبہ ساقی کو کیا ہوا تھا

مقتل کو کس نشاط سے جاتا ہوں میں کہ ہے
پُر گل خیالِ زخم سے دامن نگاہ کا

شمع بجھتی ہے تو اُس میں سے دُھواں اٹھتا ہے
شعلۂ عشق سیاہ پوش ہوا میرے بعد

اِن آبلوں سے پاؤں کے گھبرا گیا تھا میں
جی خوش ہوا ہے راہ کو پُر خار دیکھ کر

نہ لڑ ناصح سے غالبؔ کیا ہوا گر اُس نے شدّت کی
ہمارا بھی تو آخر زور چلتا ہے گریباں پر

اسدؔ بسمل ہے کس انداز کا قاتل سے کہتا ہے!
کہ مشقِ ناز کر خونِ دو عالم میری گردن پر

ہوں گرفتارِ اُلفتِ صیّاد
ورنہ باقی ہے طاقتِ پرواز

مژدہ اے ذوقِ اسیری کہ نظر آتا ہے
دامِ خالی قفسِ مرغِ گرفتار کے پاس

آبرو کیا خاک اس گُل کی کہ گلشن میں نہیں
ہے گریباں ننگِ پیراہن جو دامن میں نہیں

لے گئی ساقی کی نخوت قُلزم آشامی مری
موجِ مے کی آج رگ مینا کی گردن میں نہیں

نقصاں نہیں جنوں میں بلا سے ہو گھر خراب
سو گز زمیں کے بدلے بیاباں گراں نہیں

مانع دشت نوردی کوئی تدبیر نہیں
ایک چکّر ہے مرے پاؤں میں زنجیر نہیں

مجھ تک کب اُن کی بزم میں آتا تھا دورِ جام
ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں

کم نہیں وہ بھی خرابی میں پہ وسعت معلوم
دشت میں ہے مجھے وہ عیش کہ گھر یاد نہیں

قفس میں مجھ سے رودادِ چمن کہتے نہ ڈر ہمدم
گری ہے جس پہ کل بجلی وہ میرا آشیاں کیوں ہو

خزاں کیا فصلِ گل کہتے ہیں کس کو کوئی موسم ہو
وہی ہم ہیں قفس ہے اور ماتم بال و پر کا ہے

کہتا ہے کون نالۂ بلبل کو بے اثر
پردے ہیں گل کے لاکھ جگر چاک ہو گئے

اس انجمن ناز کی کیا بات ہے غالب
ہم بھی گئے واں اور تری تقدیر کو روئے

پنہاں تھا دام سخت قریب آشیان کے
اڑنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہم ہوئے

ان اشعار میں سے ہر ایک میں غزل کی کوئی نہ کوئی مروجہ علامت استعمال ہوئی ہے لیکن ہر شعر کو پڑھتے ہی اس حقیقت کا احساس ہوتا ہے کہ اس روایت کا استعمال صرف روایتی انداز میں نہیں ہوا ہے۔ بلکہ اس روایت کے استعمال نے ہر شعر میں نئی معنوی وسعتوں کو سمو دیا ہے۔ اور ساتھ ہی ساتھ اس کے جمالیاتی اظہار میں

بھی ایک رچی ہوئی کیفیت بھی پیدا کر دی ہے۔

مندرجہ بالا اشعار ہیں مے و ساغر، ساقی، خمار تشنہ کامی، بزم مے، قلزم آشامی، موجِ مے، دورِ جام، جلوہ گل، چمن، باغ گلشن، نکہت گل، خزاں، قفس، صیاد، مرغ گرفتار، دشت نوردی، بیاباں، زنجیر، بجلی، آشیاں، شمع، انجمن، گریباں وغیرہ کی جو بے شمار علامتیں استعمال ہوئی ہیں، وہ اس میں شبہ نہیں کہ روائتی ہیں اور فارسی اور اردو میں صدیوں سے رائج رہی ہیں لیکن جس طرح غالبؔ نے ان کو استعمال کر کے اپنی معانی و مفاہیم کی وضاحت کی ہے اور جس انداز میں ان کے استعمال سے اپنے فن میں حسن کی اقدار پیدا کی ہیں وہ روائیتی نہیں ہے۔ اس میں ایک جدت ہے۔ ایک اچھوتا پن ہے اور اس جدت اور اچھوتے پن کے پیدا ہونے کی وجہ یہ ہے کہ غالب ان علامتوں اور اشاروں کو روائتی حدود میں قید نہیں رکھتے۔ بلکہ انھیں آزاد چھوڑ دیتے ہیں۔ اس طرح ان میں معنوی اور فنی دونوں اعتبار سے وسعتیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ چنانچہ ان میں کشادگی کے حسن کا احساس ہوتا ہے۔

غالب کے فن میں روائتی علامتوں اور اشاروں کے استعمال کا جو نظام ہے، اس میں بھی کہیں کہیں ان سے ملتی جلتی بعض نئی علامتیں وجود میں آجاتی ہیں۔ مثلاً گذرگاہ خیال مے و ساغر کے ساتھ جادۂ سر منزل تقوی، خمار تشنہ کامی کے ساتھ دریائے مے اور خمیازۂ ساحل، موجِ مے کے ساتھ قلزم آشامی، جلوۂ گل

کے ساتھ چراغاں، گُل تر کے ساتھ چشم خوں فشاں، پاؤں کے آبلوں کے ساتھ راہ اور اس کی پُرخار کیفیت، ذوقِ اسیری کے ساتھ دامِ خالی وغیرہ کی جو علامتیں اور اشارے ملتے ہیں، ان کی وجہ سے گُشادگی کے اس حسن میں کچھ اور بھی اضافہ ہوجاتا ہے جو ان کی روایتی علامتوں اور اشاروں کی نمایاں خصوصیت ہے۔

یہ صورت غالب کے فن میں اس وجہ سے پیدا ہوئی ہے کہ وہ بُنیادی طور پر علامتوں اور اشاروں کے شاعر ہیں اور اُن کی شاعری بے شمار علامتوں اور اشاروں سے آراستہ و پیراستہ نظر آتی ہے۔ ان علامتوں اور اشاروں میں سب سے زیادہ اہم وہ ہیں جن کی روایت اردو یا فارسی میں غالب سے قبل موجود نہیں تھی۔ غالب کے نئے احساس و شعور نے ان کو سب سے پہلے تخلیق کیا اور اپنی شاعرانہ فن کاری سے ان کے استعمال کو سحر کاری بنا دیا۔ مندرجہ ذیل اشعار میں نئی علامتوں اور اشاروں کا استعمال غالب کے فنی اجتہاد پر دلالت کرتا ہے ؎

شب ہوئی پھر انجمِ رخشندہ کا منظر کھلا
اس تکلّف سے کہ گویا بُت کدے کا دَر کھلا

گرچہ ہوں دیوانہ پر کیوں دوست کا کھاؤں فریب
آستیں میں دشنہ پنہاں ہاتھ میں خنجر کھُلا

کیوں اندھیری ہے شبِ غم ہے بلاؤں کا نزول
آج ادھر ہی کو رہے گا دیدۂ اختر کھُلا

مقدمِ سیلاب سے دل کیا نشاط آہنگ ہے
خانۂ عاشق مگر سازِ صدائے آب تھا

خانہ زادِ زلف ہیں زنجیر سے بھاگیں گے کیوں
ہیں گرفتارِ وفا زنداں سے گھبرائیں گے کیا

قید میں ہے ترے وحشی کو وہی زُلف کی یاد
ہاں کچھ اک رنجِ گراں باریٔ زنجیر بھی تھا

مانعِ دَشت نوردی کوئی تدبیر نہیں
ایک چکّر ہے مرے پاؤں میں زنجیر نہیں

رہزنی ہے کہ دِل ستانی ہے
لے کے دل، دِل ستاں روانہ ہوا

گھر ہمارا جو نہ روتے بھی تو ویراں ہوتا
بحر اگر بحر نہ ہوتا تو بیاباں ہوتا

ہم تھے مرنے کو کھڑے پاس نہ آیا نہ سہی
آخر اس شوخ کے ترکش میں کوئی تیر بھی تھا

آئے ہے بے کسئ عشق پہ رونا غالب
کس کے گھر جائے گا سیلابِ بلا مرے بعد

چلتا ہوں تھوڑی دور ہر اک راہرو کے ساتھ
پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں

کس روز تہمتیں نہ تراشا کئے عدو
کس دن ہمارے سر پہ آرے نہ چلا کئے

ظلمت کدے میں میرے شبِ غم کا جوش ہے
اک شمع ہے دلیلِ سحر سو خموش ہے

وہ بادۂ شبانہ کی سرمستیاں کہاں
اُٹھیے بس اب کہ لذتِ خوابِ سحر گئی

پھر جگر کھودنے لگا ناخُن
آمدِ فصلِ لالہ کاری ہے

لکھتے رہے جنوں کی حکایاتِ خوں چکاں
ہر چند اس میں ہاتھ ہمارے قلم ہوئے

ہر قدم دوریٔ منزل ہے نمایاں مجھ سے
میری رفتار سے بھاگے ہے بیاباں مجھ سے

قد و گیسو میں قیس و کوہکن کی آزمائش ہے
جہاں ہم ہیں وہاں دار و رسن کی آزمائش ہے

لختِ جگر سے ہے رگِ ہر خار شاخِ گل
تا چند باغبانیٔ صحرا کرے کوئی

ان اشعار میں جو علامات و اشارات پائے جاتے ہیں وہ اردو شاعری کے لئے بالکل نئے ہیں۔ مثلاً شب ، انجم رخشندہ ، دیوانہ ، دشنہ و خنجر ، سیلاب ، زنجیر ، زنداں ، رہزنی ، بجر ، بیاباں دشت ، تیز ذرکش ، تیز رو ، راہبر ، رہزنی ، آرہ ، خواب سحر ، ظلمت کدہ ، دلیل سحر ، فصل لالہ کاری ، جنون ، حکایات خوں چکاں ، دوریٔ منزل ، بیاباں ، دار و رسن ، باغبانی صحرا وغیرہ کی علامتیں اور اشارے ایسے ہیں جن سے اردو شاعری غالب سے قبل نا آشنا تھی۔ غالب نے ان کو اپنے گہرے ، وسیع ، ہمہ گیر اور پیچیدہ تجربات کے اظہار کا ذریعہ اور وسیلہ بنایا۔ اس طرح ان کی تخلیق عمل میں آئی اور ان علامات و اشارات نے اردو شاعری میں فنی اعتبار سے ایک انقلاب پیدا کر دیا۔

سوال یہاں یہ پیدا ہوتا ہے کہ غالبؔ نے پرانی علامتوں میں

نئی زندگی کیسے پیدا کی اور نئی علامتوں کو کیسے تخلیق کیا؟ دراصل بات یہ ہے کہ غالب اپنی فنی روایت کی تنگ دامانی کے شکوہ سنج تھے۔ انہیں اپنے بیان کے لئے کچھ اور وسعتیں درکار تھیں اور ان کے جذبات پیچیدہ، خیالات وسیع اور افکار ہمہ گیر تھے۔ اس لئے ان کے تجربات کی تہ در تہ کیفیت نے انہیں غیر شعوری طور پر ان علامتوں اور اشاروں کی طرف راغب کیا۔ چنانچہ ان کا ہر تجربہ کسی نہ کسی علامت یا اشارے کی صورت میں اپنے آپ کو رونما کرتا ہے۔ کہیں یہ علامتیں اور اشارے بہت واضح اور نمایاں نظر آتے ہیں۔ کہیں ایک نقاب پوشی کے عالم میں انہیں دیکھا جا سکتا ہے۔ اس عالم میں ان کے حسن میں کچھ زیادہ ہی نکھار کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے اور وہ کچھ زیادہ ہی جاذب نظر دکھائی دیتا ہے۔

غالب کی شاعری ان علامتوں اور اشاروں کا اچھا خاصا نگارخانہ ہے۔ اس نگارخانے میں ان کے تخیل کی رنگین کاریوں نے نئے نئے رنگ بکھیرے ہیں اور نور کے طوفان اٹھائے ہیں۔ چنانچہ مجموعی طور پر علامتوں اور اشاروں کے اس نگارخانے میں وہ حسن پیدا ہو گیا ہے جو بہ یک وقت رنگین اور پُرکار بھی ہے اور سادہ اور پہلو دار بھی!

رَمزیّت اَور ایمائیّت

غالب علامتوں اور اشاروں کے شاعر ہیں اور ان کی اس علامت پسندی نے بعض دوسرے عوامل کے ساتھ مل کر ان کی شاعری میں رمزیت، ایمائیت اور ابہام کے میلانات بھی پیدا کئے ہیں۔ علامت پسندی کے ساتھ جن عوامل نے ان کی شاعری میں رمزیت ایمائیت اور ابہام کے میلانات کو پیدا کیا ہے ان میں غالب کے احساس کی شدّت۔ فکر کی بلندی، خیالات کی پیچیدگی، نظریات کی گہرائی اور جمالیاتی اظہار کے نئے معیار اور فن کی نئی اقدار بھی برابر کے شریک ہیں۔ غالب رمزیت، ایمائیت اور ابہام کے ذریعے گہرے سے گہرے اور پیچیدہ سے پیچیدہ خیالات کو فن کے سانچے میں ڈھالتے ہیں۔ اس لئے رمزیت اور ایمائیت ان کے فن میں ذریعہ ہے، مقصد نہیں۔ یہ اور بات ہے کہ موضوع

اور مواد کے ساتھ ان پہلوؤں کا باہمی رابطہ اور رشتہ ان میں حسن کی اقدار کو پیدا کر دیتا ہے اور احساسِ جمال کی تسکین کا باعث بنتا ہے۔

رمزیت اور ایمائیت یوں تو ہر فن کی بُنیاد ہے لیکن شاعری اور خاص طور پر غزل کے فن میں اس کو نمایاں حیثیت حاصل ہے۔ اس کا بُنیادی سبب تو یہی ہے کہ غزل ایک محدود صنف ہے۔ اس کا کینوس بہت چھوٹا ہے لیکن اس کے باوجود وہ گہرے سے گہرے افکار و خیالات اور پیچیدہ سے پیچیدہ جذباتی تجربات کو اپنے دامن میں جگہ دیتی ہے۔ اس لئے اس کو مجبوراً رمزیت اور ایمائیت کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ پھر ایک بات یہ بھی ہے کہ غزل غنائی شاعری کے ساتھ تعلق رکھتی ہے اور شدید داخلیت پسندی اُس کی بنیاد ہے۔ اس شدید داخلیت پسندی کی وجہ سے اظہار اس میں کھل کر اور واضح طور پر نہیں ہو سکتا۔ غزل کے شاعر ہر دور میں رمز و ایما کے پردے میں اظہار و ابلاغ کرتے رہے ہیں اور اُنھوں نے اس رمز و ایما کو غزل کے مزاج کا جزو بنا دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ غزل کے فن کے ساتھ رمز و ایما اور رمز و ایما کے ساتھ غزل کے فن کا خیال آتا ہے۔

غالب نے اپنے فن میں رمز و ایما کے اس رُجحان کو کچھ اور بھی آگے بڑھایا ہے۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ وہ غزل کے صحیح مزاج داں تھے۔ اور اس کے فنّی اصولوں کا گہرا شعور رکھتے تھے۔ اُنہیں اِس حقیقت کا علم تھا کہ غزل صِرف رمزیت اور

ایمائیت ہی کے سہارے اپنے دامن میں وسعتیں پیدا کر سکتی ہے۔ چنانچہ اُنہوں نے رمزیت اور ایمائیت سے کام لے کر اس صنف میں یہ وسعتیں پیدا کیں۔ غالب کے فلسفیانہ مَیلانِ طبع اور اجتماعی شعور نے انہیں اس کام کی طرف کچھ زیادہ ہی آمادہ کیا۔ فارسی اور اُردو غزل کی روایت میں تصوّف نے رمزیت اور ایمائیت کو پیدا کرنے کے سلسلے میں جو کارہائے نمایاں انجام دیئے تھے، ان کو انہوں نے اپنے لئے شمعِ راہ بنایا۔ چنانچہ انہوں نے مسائل تصوّف کو رمز و ایما کے پردے میں بیان کیا۔ اور مسائل تصوّف سے ملے ہوئے حیات و کائنات کے معاملات کی فلسفیانہ تاویل بھی رمز و ایما کے پیرائے میں کی۔ اجتماعی شعور سے کام لے کر انہوں نے سیاسی، معاشرتی اور تہذیبی معاملات و مسائل کے موضوعات کو بھی اپنی شاعری میں جگہ دی اور انفرادی رنگ کے پردے میں اجتماعی تجربات کی ترجمانی کی۔ ان حالات کی وجہ سے رمزیت اور ایمائیت کا رنگ اُن کی شاعری میں کچھ زیادہ ہی گہرا ہو گیا، اور اس نے ان کے فن میں ایک مستقل حیثیت اختیار کر لی۔ چنانچہ غالب کے کلام میں شروع سے آخر تک اس رمز و ایما کی ایک لہر سی دوڑی ہوئی نظر آتی ہے۔ صرف چند اشعار ان کے اس فنی میلان کو ظاہر کرنے کے لیئے کافی ہیں ؎

غنچہ پھر لگا کھلنے آج ہم نے اپنا دل
خوں کیا ہوا دیکھا گُم کیا ہوا پایا

بوئے گُل، نالۂ دل، دُودِ چراغ محفل
جو تری بزم سے نکلا سو پریشاں نکلا

ہوائے سیرِ گل آئینۂ بے مہریٔ قاتل
کہ اندازِ بخوں غلطیدنِ بسمل پسند آیا

پھر ترے کوچے کو جاتا ہے خیال
دلِ گم گشتہ مگر یاد آیا

تو اور آرائشِ خمِ کاکُل!
میں اور اندیشہ ہائے دور دراز

نظر لگے نہ کہیں اُن کے دست و بازو کو
یہ لوگ کیوں مرے زخمِ جگر کو دیکھتے ہیں

دے کے خط مُنہ دیکھتا ہے نامہ بر
کچھ تو پیغامِ زبانی اور ہے

اُن کے دیکھے سے جو آجاتی ہے مُنہ پہ رونق
وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے

چپکے چپکے مجھُ کو روتے دیکھ پاتا ہے اگر
ہنس کے کرتا ہے بیانِ شوخیٔ گفتارِ دوست

عاشقی صبر طلب اور تمنّا بے تاب
دِل کا کیا رنگ کروں خونِ جگر ہونے تک

رازِ معشوق نہ رُسوا ہو جائے
ورنہ مر جانے سے کچھ بھید نہیں

تماشا کر اے محوِ آئینہ داری
تجھے کس تمنّا سے ہم دیکھتے ہیں

قاصد کے آتے آتے خط اک اور لکھ رکھوں
میں جانتا ہوں جو وہ لکھیں گے جواب میں

مئے عشرت کی خواہش ساقیٔ گردوں سے کیا کیجیے
لیے بیٹھا ہے اک دو چار جامِ واژگوں وہ بھی

ہماری سادگی تھی اِلتفاتِ ناز پر مرنا
ترا آنا نہ تھا ظالم مگر تمہید جانے کی

حالانکہ ہے یہ سیلیٔ خارا اسے لالہ رنگ
غافل کو میرے شیشے پہ مَے کا گمان ہے

عمر ہر چند کہ ہے برق خرام
دِل کے خوں کرنے کی فرصت ہی سہی

گرچہ ہے طرزِ تغافل پردہ دارِ رازِ عشق
پر ہم ایسے کھوئے جاتے ہیں کہ وہ پاجائے ہے

ان اشعار میں مختلف طریقوں سے رمز و ایما کی کیفیت کو پیدا کیا گیا ہے۔ کہیں ان میں علامتیں استعمال کی گئی ہیں۔ کہیں اشاروں سے کام لیا گیا ہے۔ کہیں موضوع کے بعض حصّے چھوڑ دیئے گئے ہیں۔ کہیں خیال کو ادھورا رکھا گیا ہے۔ کہیں ایسی صورت پیدا کی گئی ہے کہ پڑھنے والے کا تخیّل بعض ایسی چیزوں کو پورا کرے جن کو جان کر چھوڑ دیا گیا ہے۔ کہیں مضمون کے بعض پہلوؤں کو چھپانے کی کوشش کی گئی ہے تاکہ پڑھنے والے کے لئے تجسّس کی فضا پیدا ہو۔ غرض غالب نے اپنے بیشتر اشعار میں جو رمزیت اور ایمائیت پیدا کی ہے اس میں ایک باقاعدہ

نظام ملتا ہے اور اس نظام کی تہ میں نفسیاتی اور جمالیاتی عوامل کام کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ غالب نے اس طرح رمزیت اور ایمائیت کو انسانی فطرت سے ہم آہنگ کیا ہے اور اس میں حسن و جمال کی ایسی اقدار پیدا کر دی ہیں جن کو انسان فطری طور پر اپنے احساس جمال کی تسکین کے لیے ضروری سمجھتا ہے۔ غالب کی رمزیت اور ایمائیت حیرت اور تجسس کے تاروں کو چھیڑتی ہے اور پڑھنے والے میں غیر شعوری طور پر خود اعتمادی کا احساس پیدا کر کے کچھ حاصل کرنے کے جذبے کو بھی بیدار کرتی ہے۔

غالب نے اپنے فن میں اس رمزیت اور ایمائیت سے بڑی پہلودار کیفیت پیدا کر دی ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے اس میں بجلی سی چمک رہی ہے، تتلیاں سی اُڑ رہی ہیں اور جگنو سے جگمگا رہے ہیں۔

ان تمام چیزوں کے حسن کی طرح غالب کے فن کی رمزیت اور ایمائیت کے حسن کو بھی صرف محسوس ہی کیا جا سکتا ہے۔

اس میں شبہ نہیں کہ رمز و ایما کے حسن کو پیدا کرنے میں غالب اپنا جواب نہیں رکھتے۔ انھوں نے اس معاملے میں بڑی چابک دستی کا ثبوت دیا ہے۔ لیکن اس کے باوجود یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ بعض مقامات ان کے فن میں ایسے بھی آتے ہیں جہاں توازن کا دامن ان کے ہاتھ سے چھوٹ جاتا ہے۔ اور ان کی رمزیت اور ایمائیت پیچیدہ اور دور از کار ہو کر ابہام

کی سرحدوں میں داخل ہو جاتی ہے۔ اس عالم میں اس کا سمجھنا آسان نہیں ہوتا۔ بعض لوگوں نے اس کو غالب کے فن کا عیب بتایا ہے لیکن بعضوں نے اس کو ان کے فن کی نمایاں ترین خصوصیت قرار دے کر اس کو سراہنے کی کوشش کی ہے۔

غالب کے فن میں ابہام کا میلان بہت واضح ہے لیکن اس میلان کو غالب کی شاعری کا عیب نہیں سمجھنا چاہئے۔ کیونکہ ابہام کا میلان بعض خاص حالات کی وجہ سے ان کے فن میں پیدا ہوا ہے۔ اگر ان حالات کو سامنے رکھا جائے اور اس ابہام کے محرکات کا سراغ مل جائے تو اس میں حسن کے بعض پہلو بھی نظر آنے لگتے ہیں اور وہ ان کے فن اور جمالیاتی اظہار کا ایک اہم حصہ معلوم ہونے لگتا ہے۔

اس ابہام کے میلان کو پیدا کرنے میں غالب کی مخصوص افتاد طبع، ان کا مخصوص مزاج، ان کی مخصوص شخصیت، اس شخصیت پر بعض اہم شخصیتوں کے اثرات، ان کا مخصوص ماحول اور مخصوص حالات، ان کے مخصوص افکار و خیالات، اور ان کے مخصوص فنی نظریات کا بڑا ہاتھ ہے۔ افتادِ طبع اور طبیعت کے اعتبار سے غالب مشکل پسند تھے۔ ان کے مزاج میں تن آسانی اور سہل انگاری نہیں تھی۔ وہ تھک کر بیٹھنا نہیں جانتے تھے۔ خوب سے خوب تر کی تلاش میں سرگرداں رہنے میں انہیں لطف آتا تھا۔ ان کی شخصیت نہایت پہلودار تھی۔ اور وہ ہر بات میں پہلو نکالتے اور ہر چیز میں پہلو پیدا کرتے تھے۔ ان پر فارسی کے بعض مشکل پسند شاعروں کا

اثر بہت گہرا تھا۔ خاص طور پر بیدلؔ سے وہ بہت متاثر تھے۔ ان کے ماحول میں بھی مشکل پسندی کا دور دورہ تھا۔ سیاسی، معاشرتی اور تہذیبی انحطاط و زوال نے ہر شخص کو کسی نہ کسی اعتبار سے مشکل پسند ضرور بنا دیا تھا۔ اس مشکل پسندی سے درحقیقت وہ اس خلاء کو پُر کر رہے تھے جو انحطاط و زوال کے باوجود اس زمانے میں بعض ذہنی اور فکری تحریکوں کی وجہ سے زندگی کے آثار بھی موجود تھے۔ فکر کی گہرائی اور خیال کی رفعت ماحول میں عام تھی۔ چنانچہ لوگ بلندی سے بات کرنا اور سننا پسند کرتے تھے۔ ان حالات نے فن کے معیاروں میں بھی انقلاب پیدا کر دیا تھا۔ اب صرف سادگی اور صفائی ہی فن کا معیار نہیں تھی، تہہ داری کی کیفیت کے ساتھ ایک پیچ دار انداز بھی فن کا معیار بن گیا تھا۔

یہ حالات تھے جن کی وجہ سے غالب کے فن میں ابہام کا میلان پیدا ہوا۔ اس میں ان کی کوئی شعوری کوشش شامل نہیں تھی۔ اس میلان کو تو ان کے فن میں پیدا ہونا ہی چاہیے تھا۔ بات یہ ہے کہ وہ ایک رومانی مزاج فن کار تھے۔ رومانی فنکار کی بنیاد تخیل کی بلند پروازی ہوتی ہے۔ اس تخیل کے سہارے وہ ایسے مقامات تک پہنچتا ہے جہاں ہر شخص کا پہنچنا آسان نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ بہت سے لوگ اس کے فن کی بلندیوں کو چھو نہیں سکتے۔ وہ بعض اوقات عام لوگوں کے لئے اجنبی ہو جاتا ہے اور وہ اس کے ساتھ وادیٔ خیال کو مستانہ طے نہیں

کر پاتے۔ ابہام کا تصوّر ایسے ہی مواقع پر رونما ہوتا ہے۔ ہربرٹ ریڈ نے صحیح لکھا ہے کہ ابہام شاعر کے یہاں نہیں ہوتا خود پڑھنے والوں کے ذہنوں میں ہوتا ہے۔ جب وہ شاعر کے پیچیدہ تجربات کی تہ تک نہیں پہنچ پاتے اور اس کی پرواز کا ساتھ نہیں دے سکتے تو اس کے کلام کو مبہم تصوّر کر لیتے ہیں۔

ویسے ابہام شاعری کے لیے بہ ذات خود بھی کوئی اجنبی اور نامانوس چیز نہیں ہے۔ ارسطو کے زمانے سے لے کر اس وقت تک شاعری کے نقادوں نے کسی نہ کسی زاویے سے شاعری میں ابہام کی اہمیت اور ضرورت کو تسلیم کیا ہے۔ ولیم ایمپسن نے اپنی کتاب (SEVEN TYPES OF AMBIGIUTIES) میں لکھا ہے کہ ابہام شاعری کے لئے کوئی نئی چیز نہیں ہے۔ وہ ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ اس کو شاعری کے لئے ناخوشگوار اور ناسزا بھی نہیں سمجھنا چاہئے۔ اس خیال میں بڑی صداقت ہے کیونکہ شاعری کے بے شمار پہلو ایسے ہیں جن کی وضاحت نہیں کی جا سکتی۔ خاص طور پر اس کا حُسن بہت تہ در تہ ہوتا ہے۔ اس کو تو صرف محسوس ہی کیا جا سکتا ہے۔

پھر ایک بات یہ بھی ہے کہ شاعری معنوی اعتبار سے بڑی پہلودار چیز ہے۔ ایک معمولی سے شعر میں بھی کئی معنی ہوتے ہیں۔ آئی۔ اے۔ رچرڈز نے اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ کسی نظم یا شعر میں معنی کے چار پہلوؤں کو دیکھنا چاہئے۔ یعنی اس میں کیا محسوس کیا گیا ہے؟ شاعر کے شعور کی کیا کیفیت ہے؟ اس

کی تہ میں بُنیادی مقصد کیا ہے اور شاعر کا اپنے پڑھنے والے کی طرف رویّہ کیا ہے؟ ظاہر ہے کہ اس طرح شاعری کے معنوی پہلو کو دیکھا جائے تو وہ خاصی پیچیدہ چیز ہو جاتی ہے۔ اسی لئے اس میں ابہام کا احساس ہوتا ہے۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ شاعری کی معنویت بڑی متنوع، وسیع اور ہمہ گیر ہوتی ہے۔ اسی لئے نی ٹشے نے اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ جو چیز بھی ہمہ گیر ہوتی ہے وہ اپنے آپ کو زیادہ سے زیادہ چھپانے کی کوشش کرتی ہے۔ شاعری پر یہ بات صادق آتی ہے۔ وہ بھی ایک ہمہ گیر چیز ہے۔ اس لئے اس میں بہت سی باتوں کو چھپا کر پیش کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اسی لئے ابہام اس کا لازمی جُز بن جاتا ہے۔

غالب کی شاعری میں جو ابہام ہے اِس میں بھی یہی صورت نظر آتی ہے۔ تہ در تہ معنویت اس کی بُنیاد ہے۔ اس کی تعمیر و تشکیل پیچیدہ جذبات و احساسات، گہرے افکار و خیالات اور جمالیاتی اظہار کے پہلو دار انداز کے ہاتھوں ہوتی ہے۔ یہ اشعار دیکھئے ؎

مری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی
ہیولا برقِ خرمن کا ہے خونِ گرم دہقاں کا

خموشی میں نہاں خوں گشتہ لاکھوں آرزوئیں ہیں
چراغِ مُردہ ہوں میں بے زباں گورِ غریباں کا

کچھ نہ کی اپنے جنونِ نارسا نے ورنہ یاں
ذرّہ ذرّہ روکشِ خورشیدِ عالم تاب تھا

رگِ سنگ سے ٹپکتا وہ لہو کہ پھر نہ تھمتا
جسے غم سمجھ رہے ہو یہ اگر شرار ہوتا

حنائے پائے خزاں ہے بہار اگر ہے یہی
دوامِ کلفتِ خاطر ہے عیشِ دنیا کا

ربطِ یک شیرازۂ وحشت ہیں اجزائے بہار
سبزہ بیگانہ، صبا آوارہ، گُل نا آشنا

محفلیں برہم کرے ہے گنجفہ بازِ خیال
ہیں ورق گردانیٔ نیرنگِ یک بُت خانہ ہم

رونقِ ہستی ہے عشقِ خانہ ویراں ساز سے
انجمن بے شمع ہے گر برق خرمن میں نہیں

نغمہ ہائے غم کو ہی اے دل غنیمت جانیے
بے صدا ہو جائے گا یہ سازِ ہستی ایک دن

مانعِ دشت نوردی کوئی تدبیر نہیں
ایک چکّر ہے مرے پاؤں میں زنجیر نہیں

ہے مشتمل نمودِ صور پر وجودِ بحر
یہاں کیا دھرا ہے قطرۂ و موج و حباب میں
ہے غیب غیب جس کو سمجھتے ہیں ہم شہود
ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں

ہیں زوال آمادہ اجزا آفرینش کے تمام
مہرِ گردوں ہے چراغِ رہ گذارِ بادیاں

نشۂ رنگ سے ہے واشدِ گل
مست کب بندِ قبا باندھتے ہیں
اہلِ تدبیر کی واماندگیاں
آبلوں پر بھی حنا باندھتے ہیں

ہے آدمی بجائے خود اک محشرِ خیال
ہم انجمن سمجھتے ہیں خلوت ہی کیوں نہ ہو

غمِ دنیا سے گر پائی بھی فرصت سر اٹھانے کی
فلک کا دیکھنا تقریب تیرے یاد آنے کی

کھلے گا کس طرح مضموں مرے مکتوب کا یارب
قسم کھائی ہے اس کافر نے کاغذ کے جلانے کی

ہے وہی بد مستیٔ ہر ذرہ کا خود عذر خواہ
جس کے جلوے سے زمیں تا آسماں سرشار ہے

کارگاہِ ہستی میں لالہ داغ ساماں ہے
برقِ خرمنِ راحت خونِ گرمِ دہقاں ہے

غنچۂ ناشگفتہ ہا برگ عافیت معلوم
باوجودِ دلجمعی خوابِ گل پریشاں ہے

ہر چند ہر اک شے میں تو ہے
پر تجھ سی تو کوئی شے نہیں ہے

نہیں بہار کو فرصت نہ ہو بہار تو ہے
طراوتِ چمن و خوبیٔ ادا کہیے

اس میں شبہ نہیں کہ ان اشعار میں ابہام ہے۔ یہ بہت صاف اور سادہ نہیں ہیں۔ ان کی معنویت پیچیدہ اور پہلو دار ہے۔ غالب کے شارحین نے اس قسم کے اشعار پر خوب خوب

خامہ فرسائی کی ہے اور ان سب کی شرح کو سامنے رکھا جائے تو ان اشعار کے مفہوم کی تہہ تک پہنچنا شاید اور بھی مشکل ہو۔ لیکن جو کچھ ان لوگوں نے لکھا ہے، اس سے کم از کم اتنا اندازہ ضرور ہو جاتا ہے کہ غالب معنوی اعتبار سے ایسے متنوع اور پہلو دار اشعار بھی کہہ سکتے تھے۔ ان میں ابہام نہیں ہے۔ ابہام کا حسن ہے اور یہی ان کا فنی کارنامہ ہے۔

غالب نے اس ابہام کو ایک اسلوب بنا دیا ہے۔ اس کو فن کی صورت دے دی ہے اور اس فن کو جمالیاتی اعتبار سے انتہائی بلندیوں پر پہنچا دیا ہے۔ انہیں خود بھی اس حقیقت کا شدید احساس ہے۔ جب ہی تو انہوں نے اپنے اس اسلوب اور فن کے بارے میں اس قسم کے اشعار کہے ہیں۔

ع نہ ستائش کی تمنا ہے نہ صلے کی پروا
گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی نہ سہی

مشکل ہے زبس کلام میرا اے دل
سن سن کے اسے سخنوران کامل
آسان کہنے کی کرتے ہیں فرمائش
گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل

ہمارے شعر ہیں اب صرف دل لگی کے اسدؔ
کھُلا کہ فائدہ عرضِ ہنر میں خاک نہیں

پاتا ہوں اس سے داد کچھ اپنے سخن کی میں
روح القدس اگرچہ مرا ہم زبان نہیں

آگہی دامِ شنیدن جس قدر چاہے بچھائے
مدعا عنقا ہے اپنے عالمِ تقریر کا

ہوں گرمئ نشاطِ تصور سے نغمہ سنج
میں عندلیبِ گلشنِ نا آفریدہ ہوں

ان اشعار میں غالب کا یہ کہنا کہ انہیں نہ ستائش کی تمنا ہے نہ صلے کی پروا۔ اگر لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ان کے اشعار میں معنی نہیں ہیں تو وہ اس کی پرواہ نہیں کرتے۔ ان کا کلام مشکل ہے۔ بڑے بڑے سخنور انِ کامل اس کوشش کر آسان کہنے کی فرمائش کرتے ہیں۔ ان کے لئے بڑی مشکل ہے۔ کہیں تب مشکل نہ کہیں تب مشکل۔ ان کے اشعار تو اب صرف دل لگی کے لئے رہ گئے ہیں اب ان پہ یہ بات روشن ہوئی ہے کہ ان کا کوئی سمجھنے والا نہیں۔ اس لئے عرضِ ہنر بے کار ہے۔ وہ تو اپنے سخن کی داد روح القدس سے پاتے ہیں حالانکہ وہ بھی ان کا ہم زبان نہیں

ہے۔ عقل خواہ کتنے ہی دام بچھائے لیکن ان کے خیال کو اسیر نہیں کر سکتی۔ ان کے عالمِ تقریر کا مدعا تو عنقا ہے۔ وہ تو گرمئ نشاطِ تصوّر سے نغمہ سنج ہیں اور ان کی حیثیت تو ایک عندلیب گلشن نا آفریدہ کی ہے۔ اس حقیقت کو صاف ظاہر کرتا ہے کہ انہیں اپنے فن کے مبہم ہونے پر ناز تھا اور وہ اس کو اپنی وسیع، ہمہ گیر کو تہہ در تہہ معنویت کے اظہار و ابلاغ کے لیے مستحسن اور ضروری خیال کرتے تھے۔

اور یہ ابہام بھی درحقیقت اس رمزیت اور ایمائیت ہی کا ایک اور روپ تھا جس کو جمالیاتی اظہار اور فن کے لئے ہر دور میں ضروری قرار دیا گیا ہے۔

تصویر کاری اور پیکر تراشی

غالب کی شاعری میں اُن کی تصویر کاری اور پیکر تراشی یا امیجری بھی خصوصیت کے ساتھ اہمیت رکھتی ہے۔ اُن کا کلام ان تصویروں اور پیکروں کا ایک نگارخانہ ہے۔ ان تصویروں کے رنگ بڑے گہرے اور شوخ ہیں۔ ان کے نقوش بڑے ہی تیکھے اور پہلو دار ہیں۔ یہ تصویریں سیدھی، سادی اور سپاٹ نہیں ہیں۔ ان میں تو ایک طرح کا اُبھار پایا جاتا ہے اور یہ اُبھار زندگی اور جولانی کی نشانی ہے۔ یہ تصویریں چلتی پھرتی، حرکت کرتی اور بولتی نظر آتی ہیں۔ غالب کا کمال یہ ہے کہ اُنھوں نے ان بے جان تصویروں میں جان ڈال دی ہے اور ان تصویروں کا کمال یہ ہے کہ وہ صرف نظر ہی کے لئے دل کشی کا سامان فراہم نہیں کرتیں۔ انسان کے تمام حواس کو متأثر کرنا ان کا شعار ہے۔

شاعری میں تصویروں اور پیکروں کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ بعض نقادوں نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ شاعری صرف اِن تصویروں اور پیکروں کے مجموعے کا نام ہے جن کو الفاظ کے لباس میں نمایاں کیا جاتا ہے۔ یہ بات شاید پوری طرح صحیح نہ ہو کیونکہ شاعری صرف تصویروں اور پیکروں ہی کا نام نہیں ہے۔ ان کے علاوہ بھی بہت کچھ ہے۔ البتہ اِن کے بغیر شاعری میں وہ بات پیدا نہیں ہوسکتی جس کی اس سے توقع کی جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ارسطو کے زمانے سے لے کر اس وقت تک شاعری کے مزاج داں ان تصویروں اور پیکروں کی اہمیت کے قائل رہے ہیں۔ اور اپنی اپنی تنقیدی اصطلاحوں میں انھوں نے اپنے اپنے مخصوص انداز میں ان کی اہمیت کو واضح کیا ہے۔ ان کی باتوں سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ شاعری ان تصویروں اور پیکروں کے سہارے زندگی سے زیادہ بھرپور ہو جاتی ہے اور ساتھ ہی اس میں جمالیاتی اعتبار سے رنگینی اور رعنائی کے پہلو بھی پیدا ہو جاتے ہیں۔

بات درحقیقت یہ ہے کہ شاعری میں تصویروں اور پیکروں کا وجود اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ شاعر کی گرفت اپنے موضوع پر بہت مضبوط ہے۔ اور جس چیز کو وہ پیش کرنا چاہتا ہے اس نے اس کی شخصیت کا جزُ بن کر ایک مکمل تجربے کی صورت اختیار کی ہے اور اسی تجربے کے زیرِ اثر اس کے جمالیاتی اظہار نے مختلف تصویروں اور پیکروں کا روپ اختیار کر لیا ہے۔ چنانچہ شاعر کے تراشے ہوئے یہ پیکر اس کے فن کو مؤثر بنانے میں

نمایاں کام کرتے ہیں۔ ان کا اثر پڑھنے والے یا سُننے والے کے حواس پر ہوتا ہے اور وہ ان حواس کے تاروں کو چھیڑ کر ایک ایسی کیفیت پیدا کر دیتے ہیں جس کی وجہ سے وہ ایک عالمِ سرخوشی میں پہنچ جاتا ہے۔ اور یہی شاعری اور شاعرانہ فن کاری کی معراج ہے۔

ایک بلند پایہ شاعر انہیں پیکروں اور تصویروں سے پہچانا جاتا ہے اور اس کے شاعرانہ فن کی اندازہ دانی اسی پیمانے سے کی جاتی ہے کہ اس نے کتنی جان دار، مؤثر اور دلآویز تصویروں اور پیکروں کی تخلیق کی ہے۔ اِذرا پاؤنڈ نے لکھا ہے کہ ایک صحیح تصویر اور پیکر وہ ہے جو ایک لمحے میں شاعر کے جذباتی اور ذہنی تجربے کو پیش کرے۔ اسی صورت میں ان تصویروں اور پیکروں میں جان پڑ سکتی ہے، ورنہ تصویروں اور پیکروں کا پیش کرنا تو کوئی ایسی مشکل بات نہیں ہے۔ ہر بات ایک تصویر کو سامنے لا کر کھڑا کر سکتی ہے اور ہر خیال ایک پیکر کو نمایاں کر سکتا ہے۔ پاؤنڈ نے اسی وجہ سے یہ لکھا ہے کہ شاعر اگر اپنی زندگی میں صرف ایک تصویر بناتے اور ایک پیکر تراشے تو اس کے لئے کافی ہے کیونکہ بے شمار بے جان پیکروں کا تراشنا اور تصویروں کا بنانا شاعر کے لئے کوئی قابلِ تعریف بات نہیں۔

شاعری میں تصویروں اور پیکروں کے اثر کا دائرہ محدود نہیں ہوتا۔ وہ تو پھیل کر بیکراں ہو جاتا ہے کیونکہ وہ صرف مشاہدے ہی سے رشتہ نہیں جوڑتے بلکہ محسوسات سے تعلق

پیدا کرتے ہیں۔ اسی لئے ان کا میدان بہت وسیع ہو جاتا ہے۔ پھر ایک بات یہ بھی ہے کہ ان تصویروں اور پیکروں کی حیثیت علامتی بھی ہوتی ہے۔ اور وہ اپنے اثر سے بے شمار دوسری تصویروں کو بناتے اور پیکروں کو تراشتے ہیں اور اس طرح شاعری میں تصویروں اور پیکروں کا ایک مرقع سا تیار ہو جاتا ہے۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہے کہ ایک نگارخانہ سا بن جاتا ہے۔

کولرج نے اپنی تحریروں میں ان تصویروں اور پیکروں کی اہمیت کی وضاحت کی ہے اور شاعری کے فن میں ان کے مرتبے کو متعین کیا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ یہ تصویریں بذات خود چاہے کتنی ہی حسین اور دلآویز ہوں لیکن اس وقت تک مؤثر نہیں ہو سکتیں جب تک ان کے پیچھے شاعر کی ذہانت وفطانت اور اس کی کسی خاص کیفیت اور جذبے کا ہاتھ نہ ہو۔ اور اس سے کولرج کا مطلب یہ ہے کہ شاعری میں جو تصویریں بھی پیش کی جائیں اور جو پیکر بھی تراشے جائیں، ان میں شاعر کی شخصیت اور اس کے تجربے کا لہو ضرور ہونا چاہیے۔ کیونکہ اس سے ان میں زندگی پیدا ہوتی ہے اور اس کی وجہ سے ان تصویروں اور پیکروں کے علاوہ دوسری ان گنت ایسی تصویروں اور پیکروں کی تخلیق ہوتی ہے جن کا تعلق کسی نہ کسی طرح شاعر کے شاعرانہ تجربے سے ہوتا ہے۔

غالب نے اپنی شاعری میں جو تصویریں بنائی ہیں اور جو پیکر تراشے ہیں، ان میں وہ تمام خصوصیات پائی جاتی ہیں جن کا

ذکر اُوپر ہوا ہے۔ غالب کی شاعری تصویروں اور پیکروں کا مُرقّع بلکہ نگارخانہ ہے۔ انہوں نے اردو شاعری کی مروّجہ تصویروں اور پیکروں کو بھی اپنے شاعرانہ تجربات کے اظہار کے لیۓ استعمال کیا ہے۔ اور ان تجربات کی وسعت، تنوع اور ہمہ گیری کے پیشِ نظر بے شمار نئی تصویروں کو بنایا اور نئے پیکروں کو تراشا ہے۔ اِن کے لیۓ مواد اُنہوں نے اپنی تاریخ و تہذیب اور مخصوص حالات کے زیرِ اثر تشکیل پانے والی اپنی مخصوص ذہنی کیفیت سے حاصل کیا ہے۔ یہ تصویریں اور پیکر جو غالب کی شاعری میں ملتے ہیں، وہ اُن کے سیاسی، معاشرتی، تہذیبی حالات، نجی معاملات اور اُن کے زیرِ اثر پرورش پانے والی ذہنی کیفیات کا آئینہ ہیں۔

یہ بات اِس سے قبل بھی کہی جا چکی ہے کہ غالب ایک تہذیب کی پیداوار اور ایک تہذیبی روایت کے علم بردار ہیں۔ ان کی شخصیت پر اس تہذیب اور تہذیبی روایت کی گہری چھاپ نظر آتی ہے۔ غالب کا زمانہ اگرچہ اس تہذیب اور تہذیبی روایت کے انحطاط و زوال کا زمانہ ہے لیکن اس کے باوجود یہ تہذیبی روایت غالب کے زمانے میں اپنے شباب پر نظر آتی ہے۔ اس زمانے میں انحطاط و زوال کی کیفیت نے ایک عظمت کا احساس بھی افراد میں بڑھا دیا تھا۔ غالب کے یہاں بھی اس کا احساس شدید ہے۔ اور وہ صحیح معنوں میں احساسِ عظمت کے اس رُجحان کی نمائندگی کرتے ہیں جو اس زمانے کے افراد میں موجود تھا۔ ظاہر ہے کہ یہ ترکی اور ایرانی تہذیبوں کی نکھری ہوئی صورت تھی جس نے اس

برعظیم میں ہندوستانی تہذیب کے ساتھ مل کر ایک نہایت ہی ترستی ہوئی صورت اختیار کر لی تھی۔ غالب نے اسی تہذیب کی گود میں آنکھ کھولی اور اسی کے سائے میں اُن کی نشوونما ہوئی۔ اُنھوں نے اسی تہذیب اور تہذیبی روایت کو اپنی دُنیا سمجھا، اور اس کی ایک ایک چیز کو اپنے سینے سے لگانے کی کوشش کی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شخصیت اور شاعری دونوں میں اس تہذیب اور تہذیبی روایت کے اثرات اتنے گہرے نظر آتے ہیں۔

غالب کی امیجری، تصویرکاری اور پیکر تراشی میں بھی اسی تہذیبی روایت کا اثر مختلف زاویوں سے اپنے آپ کو رونما کرتا ہے۔ مثلاً اس تہذیبی روایت کی بُنیادی خصوصیات یہ تھیں کہ افراد محفلیں سجاتے تھے، بزم ہائے عیش ونشاط کو آراستہ کرتے تھے۔ مے و مینا کی باتیں کرتے تھے۔ جام چھلکاتے تھے اور مست ہو جاتے تھے۔ غالب کی شاعری میں یہ تصویریں اور پیکر بہت نمایاں نظر آتے ہیں۔ یہ اشعار دیکھیے:-

---

دل گذر گاہِ خیالِ مے و ساغر ہی سہی
گر نفس جادۂ سر منزلِ تقویٰ نہ ہوا

بقدرِ ظرف ہے ساقی خمارِ تشنہ کامی بھی
جو تو دریائے مے ہے، تو میں خمیازہ ہوں ساحل کا

قطرۂ مے بس کہ حیرت سے نفس پرور ہوا
خطِ جامِ مے سراسر رشتۂ گوہر ہوا

میں اور بزمِ مے سے یوں تشنہ کام آؤں
گر میں نے کی تھی توبہ ساقی کو کیا ہوا تھا

بے مے کسے ہے طاقتِ آشوبِ آگہی
کھینچا ہے عجزِ حوصلہ نے خط ایاغ کا

ہم سے کھل جاؤ بوقتِ مے پرستی ایک دن
ورنہ ہم چھیڑیں گے رکھ کر عذرِ مستی ایک دن
قرض کی پیتے تھے مے لیکن سمجھتے تھے کہ ہاں
رنگ لائے گی ہماری فاقہ مستی ایک دن

غالب چھٹی شراب پر اب بھی کبھی کبھی
پیتا ہوں روزِ ابر و شبِ ماہتاب میں

جاں فزا ہے بادہ جس کے ہاتھ میں جام آگیا
سب لکیریں ہاتھ کی گویا رگِ جاں ہو گئیں

جب میکدہ چھٹا تو پھر اب کیا جگہ کی قید
مسجد ہو مدرسہ ہو، کوئی خانقاہ ہو

مے سے غرض نشاط ہے کس روسیاہ کو
اک گونہ بے خودی مجھے دن رات چاہیے

مئے عشرت کی خواہش ساقیٔ گردوں سے کیا کیجے
لئے بیٹھا ہے اک دو چار جامِ واژگوں وہ بھی

رندانِ درِ مے کدہ گستاخ ہیں زاہد
زنہار نہ ہونا طرف اِن بے ادبوں کے

جا دادِ بادہ نوشیٔ رنداں ہے شش جہت
غافل گماں کرے ہے کہ گیتی خراب ہے

شب کہ وہ مجلس فروزِ خلوتِ ناموس تھا
رشتۂ ہر شمع خارِ کسوتِ فانوس تھا

یاد تھیں ہم کو بھی رنگا رنگ بزم آرائیاں
لیکن اب نقش و نگارِ طاقِ نسیاں ہو گئیں

میں نے کہا کہ بزمِ ناز چاہیئے غیر سے تہی
سُن کے ستم ظریف نے مجھ کو اٹھا دیا کہ یوں

اس بزم میں مجھے نہیں بنتی حیا کیے
بیٹھا رہا اگرچہ اشارے ہوا کیے

اُس کی بزم آرائیاں سُن کر دلِ رنجور، یاں
مثلِ نقشِ مدعائے غیر بیٹھا جائے ہے

گرچہ ہے کس کس برائی سے ولے با ایں ہمہ
ذکر میرا مجھ سے بہتر ہے کہ اس محفل میں ہے

اے تازہ واردانِ بساطِ ہوائے دل
زنہار اگر تمہیں ہوسِ نائے و نوش ہے

دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو
میری سنو جو گوشِ نصیحت نیوش ہے

ساقی بہ جلوہ دشمنِ ایمان و آگہی!
مطرب بہ نغمہ رہزنِ تمکین و ہوش ہے

یا شب کو دیکھتے تھے کہ ہر گوشۂ بساط
دامانِ باغبان و کفِ گل فروش ہے

لطفِ خرامِ ساقی و ذوقِ صدائے چنگ
یہ جنّتِ نگاہ وہ فردوسِ گوش ہے

داغِ فراقِ صحبت شب کی جلی ہوئی
اک شمع رہ گئی ہے سو وہ بھی خموش ہے

پیوں شراب اگر خم بھی دیکھ لوں دو چار
یہ شیشہ و قدح و کوزہ و سبو کیا ہے

ہے ہوا میں شراب کی تاثیر
بادہ نوشی ہے بادپیمائی

گردشِ ساغرِ صد جلوۂ رنگیں تجھ سے
آئینہ داریِ یک دیدۂ حیراں مجھ سے

پلا دے اوک سے ساقی جو ہم سے نفرت ہے
پیالہ گر نہیں دیتا نہ دے شراب تو دے

وہ آیا بزم میں دیکھو نہ کہیو پھر کہ غافل تھے
شکیب و صبرِ اہلِ انجمن کی آزمائش ہے

کہتے ہوئے ساقی سے حیا آتی ہے ورنہ
ہے یوں کہ مجھے دُردِ تہہِ جام بہت ہے

ان اشعار میں مے و ساغر، قطرۂ مے، جام مے، مے پرستی، بادہ جام، مے کدہ، بے خودی، رندان در میکدہ، بادۂ نوشی رندان، ہوس نا و نوش، لطف خرام ساقی، خُم، شیشہ، قدح، کوزہ، سبو گردش ساغر صد جلوۂ رنگین، پیالہ، شراب، دُرد تہہ جام، مجلس رنگ، بزم آرائیاں، بزم ناز، محفل طرب، دامانِ باغباں، کفِ گل فروش اور شمع وغیرہ کی جو تصویریں بنائی ہیں اور جو پیکر تراشے گئے ہیں، ان کا تعلق ایک تہذیب اور تہذیبی روایت سے ہے۔ لیکن غالبؔ نے ان سب میں اپنے تجربات کا لہو اس طرح دوڑایا ہے کہ یہ تصویریں اور پیکر معنوی اور فنّی دونوں اعتبار سے محدود نظر نہیں آتے۔ برخلاف اس کے ان کے انفرادی تجربات نے ان میں وسعتیں پیدا کر دی ہیں۔ اور ان کے ساتھ، اس تہذیب، معاشرت اور اس کے زیرِ سایہ پرورش پانے والے افراد کے ذہنی اور جذباتی نشیب و فراز کی اَن گنت تصویریں آنکھوں کے سامنے آجاتی ہیں۔ کہیں کہیں ان تصویروں میں علامتوں کا رنگ ضرور نظر آتا ہے۔ لیکن جہاں تک ان تصویروں اور پیکروں کا تعلق ہے، یہ رنگ ان میں کوئی

خاص کیفیت پیدا نہیں کرتا۔ اِن میں تو جو کیفیت ہے وہ یہ ہے کہ یہ تصویریں بہ ذاتِ خود حَسین ہیں اور اپنے ساتھ بے شمار ایسی تصویروں کو پیدا کرتی ہیں جن سے ان کے حسن میں اضافہ ہوتا ہے اور جن کی وجہ سے ان کے اثر کا دائرہ زیادہ وسیع ہو جاتا ہے، اور اس اثر میں شدت بھی خاصی پیدا ہو جاتی ہے۔

اِس میں شبہ نہیں کہ غالب کی بنائی ہوئی یہ تصویریں اور تراشے ہوئے یہ پیکر نئے نہیں ہیں۔ یہ غزل کی روایت میں غالب سے قبل بھی موجود تھے۔ شاعروں نے ان سے کام بھی لیا تھا لیکن غالب سے قبل ان میں فرسودگی کے آثار نظر آتے تھے۔ غالب نے ان میں نئی زندگی پیدا کی اور کچھ ایسے رنگ بھرے جو خاصے گہرے اور تیز تھے۔ کچھ ایسے خطوط بنائے جو خاصے تیکھے اور پہلو دار تھے۔ مثلاً مے و ساغر، ساقی، بزمِ مے، مے پرستی، تشنہ کامی وغیرہ سے جو تصویریں سامنے آتی ہیں، وہ اس کے علاوہ بھی نہ جانے کیا کیا کچھ کہتی ہیں بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہے کہ نہ جانے کتنی اور تصویروں کو پیدا کرتی ہیں۔ یہ تصویریں کہیں سیاسی اعتبار سے محرومی، معاشرتی اعتبار سے پامالی اور اخلاقی اعتبار سے پس ماندگی کی تصویروں کو نمایاں کرتی ہیں۔ لیکن ان کے ساتھ کچھ کرنے کی خواہش اور اس زندگی کے مختلف پہلوؤں کو سنوارنے کی آرزو کی تصویریں بھی ان میں اُبھر کر سامنے آتی ہیں۔ غالب کے تجربات کا تنوع ان تصویروں کو بناتا اور اِن پیکروں کی تخلیق کرتا ہے۔

ان تصویروں اور پیکروں کے ساتھ ساتھ غالب کی شاعری میں

چمن، باغ، گُل، غنچہ، خوشبو، سبزہ، خزاں، بہار، باغباں، صحرا بیاباں، دشت، خار، عندلیب، بلبل وغیرہ کی تصویریں اور پیکر بھی ابھرے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ان کو تخلیق کرکے بھی غالب نے ایک فنی کارنامہ انجام دیا ہے۔ یہ تصویریں بھی، ظاہر ہے کہ نئی نہیں ہیں۔ فارسی اور اُردو شاعری کی روایت میں ان تصویروں اور پیکروں کی ایک باقاعدہ جگہ ہے۔ لیکن غالب نے ان میں بھی اپنے تجربات کا لہو دوڑا کر ان کی دنیا ہی بدل دی ہے اور اس طرح ان میں معنوی اور فنّی دونوں اعتبار سے بے اندازہ وسعتیں پیدا کر دی ہیں۔

یہ اشعار اس صورتِ حال کی وضاحت کرتے ہیں ؎

غنچہ پھر لگا کھلنے آج ہم نے اپنا دل
خوں کیا ہوا دیکھا گم کیا ہوا پایا!

بوئے گُل، نالۂ دل، دودِ چراغِ محفل
جو تری بزم سے نکلا سو پریشاں نکلا

ہے گئے خاک ہیں ہم داغِ تمنائے نشاط
تو ہو اور آپ بہ صد رنگ گلستاں ہونا

وہی اک بات ہے جو یاں نفس واں نکہتِ گُل ہے
چمن کا جلوہ باعث ہے مری رنگین نوائی کا

باغ میں مجھ کو نہ لے جا ورنہ میرے حال پر
ہر گلِ تر ایک چشمِ خوں فشاں ہو جائے گا

غمِ فراق میں تکلیفِ سیرِ گُل مت دو
مجھے دماغ نہیں خندہ ہائے بے جا کا

ربطِ یک شیرازۂ وحشت ہیں اجزائے بہار
سبزہ بیگانہ، صبا آوارہ، گُل نا آشنا

گر نہیں نکہتِ گُل کو ترے کوچے کی ہوس
کیوں ہے گردِ رہِ جولانِ صبا ہو جانا

بخشے ہے جلوۂ گُل ذوقِ تماشا غالب
چشم کو چاہیے ہر رنگ میں وا ہو جانا

شرمندہ رکھتے ہیں مجھے بادِ بہار سے
مینائے بے شراب و دلِ بے ہوائے گُل

آبرو کیا خاک اس گُل کی جو گلشن میں نہیں
ہے گریباں ننگِ پیراہن جو دامن میں نہیں

سب کہاں کچھ لالہ و گُل میں نمایاں ہوگئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہوگئیں

یہ کس بہشت شمائل کی آمد آمد ہے
کہ غیر جلوۂ گُل رہگذر میں خاک نہیں

خزاں کیا؟ فصل گُل کہتے ہیں کس کو کوئی موسم ہو
وہی ہم ہیں قفس ہے اور ماتم بال و پَر کا ہے

غُنچہ تا شگفتن ہا برگِ عافیت معلوم
باوجودِ دل جمعی خوابِ گُل پریشاں ہے

پھر اس انداز سے بہار آئی
کہ ہوئے مہر و مہ تماشائی

گلشن کو تری صحبت ازبس کہ پسند آئی ہے
ہر غُنچے کا گُل ہونا آغوش کشائی ہے

آغوشِ گُل کشودہ برائے وداع ہے
اے عندلیب! چل کہ چلے دن بہار کے

چاک مت کر جیب بے ایّام گل
کچھ ادھر کا بھی اشارہ چاہیئے

ہاں نشاط آمدِ فصلِ بہاری واہ واہ
پھر ہوا ہے تازہ سودائے غزل خوانی مجھے

نہیں بہار کو فرصت نہ ہو بہار تو ہے
طراوتِ چمن و خوبیٔ ادا کہیے!

اے عندلیب یک کفِ خس بہر آشیاں
طوفانِ آمد آمد فصلِ بہار ہے

آمد بہار کی ہے جو بلبل ہے نغمہ سنج
اڑتی سی اک خبر ہے زبانی طیور کی

لختِ جگر سے ہے رگ ہر خار شاخِ گل
تا چند باغبانیٔ صحرا کرے کوئی

دوڑے ہے پھر ہر ایک گل و لالہ پر خیال
صد گلستاں نگاہ کا ساماں کئے ہوئے

ان اشعار میں غنچہ پھر لگا کھلنے ، بوئے گل ، نکہتِ گل ، چمن کا جلوہ ، باغ ، گلِ تر ، سرِ گل ، سبزہ بیگانہ ، صبا آوارہ ، گل نا آشنا جلوۂ گل ، بادِ بہار ، ہوائے گل ، گلشن ، لالہ و گل ، خزاں ، فصلِ گل ، غنچہ تا شگفتن ہا ۔ خواب گل ، پھر اس انداز سے بہار آئی ۔ ہر غنچے کا گل ہونا ، آغوشِ گل کشودہ ، چلے دن بہار کے ، ایامِ گل ، نشاطِ آمدِ فصلِ بہاری ، طراوتِ چمن ، طوفانِ آمد آمدِ فصلِ بہار ، آمد بہار کی ہے جو بلبل ہے نغمہ سنج ، شاخِ گل ، باغبانیٔ صحرا ، صد گلستاں نگاہ کا ساماں کئے ہوتے وغیرہ کی جو تصویریں غالب نے پیش کی ہیں ، وہ اگرچہ روایت سے گہرا تعلق رکھتی ہیں لیکن اس میں انھوں نے اپنے تخیّل سے نہایت گہرے اور شوخ رنگ بھر دیئے ہیں ۔ اور اپنے احساس کی شدّت ، جذبے کی گہرائی اور فکر کی گیرائی سے جو نئی معنویت پیدا کر دی ہے ، اس کی وجہ سے ان کے تاثر کا دائرہ بہت وسیع ہو گیا ہے اور ان میں تقریباً تمام حواس کو متاثر کرنے کی صلاحیت پیدا ہو گئی ہے ۔ پھر یہ تصویریں مجموعی طور پر اتنی رنگین اور پُرکار ہیں اور ان میں ایسی رچی ہوئی کیفیت ہے جو اُردو شاعری کی روایت میں کہیں اور نظر نہیں آتی ۔

غالب کی شاعری میں ان تصویروں اور پیکروں کو ان کے گہرے تہذیبی اور معاشرتی شعور نے تخلیق کیا ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ اس تہذیب اور معاشرت کا پورا رچاؤ ان میں موجود ہے جس نے غالب کو پیدا کیا ہے اور جس کے سائے میں ان کی شخصیت

کی نشو و نما ہوئی تھی۔ لیکن غالب نے اس تہذیب اور معاشرت کو ایک عالمِ انحطاط میں بھی دیکھا ہے۔ اس میں انہیں زوال کے آثار بھی نظر آئے ہیں اور ان کے احساس میں انحطاط و زوال کے یہ تاثرات اس طرح گھُل مِل گئے ہیں کہ غالب کی تصویروں کی رنگینی اور رنگین کاری میں ایک کسک کی کیفیت پیدا ہوگئی ہے اور اس کسک کی کیفیت نے ان کی امیجری میں مجموعی طور پر ایک حُزنیہ اور المیہ رنگ کو نمایاں کر دیا ہے اور اس رنگ کے اثرات ان کے یہاں اس قدر پھیلے اور بڑھے ہیں کہ ان کی نشاطیہ اور طربیہ شاعری تک اس سے متاثر ہُوئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ غالب کی شاعری میں اس المیہ اور حُزنیہ رنگ کی ایک لہر سی دوڑی ہوئی نظر آتی ہے۔

اس صورتِ حال ہی کا یہ اثر ہے کہ غالب کی شاعری میں آگ اور خون اور اُن کے مُتعلقات کی تصویریں شاید سب سے زیادہ نمایاں ہیں۔ غالب نے اپنے اظہار و ابلاغ کے لئے ان دو چیزوں کا استعمال جتنی فراوانی سے کیا ہے، شاید اتنی فراوانی سے کسی اور چیز کا استعمال نہیں کیا۔ اس کا سبب درحقیقت یہی ہے کہ غالب نے آگ اور اس کے متعلقات کی تصویروں کے ذریعے سے اس آگ کو پیش کیا ہے جو نہ صرف ان کے دل میں دبی ہوئی تھی بلکہ ان کے آس پاس اور گرد و پیش بھی بھڑک رہی تھی۔ اور خون کی تصویروں کے ذریعے اس دریائے خون کا نقشہ کھینچا ہے جو نہ صرف اُن کے دل میں موج زن تھا بلکہ ان کے آس پاس

اور گرد و پیش بھی جس کا ایک سمندر موج زن تھا اور جس میں طوفان سے اُٹھ رہے تھے۔ پہلے آگ، شعلہ، دھواں اور خاکستر وغیرہ کی تصویریں دیکھئے ؎

بس کہ ہوں غالب اسیری میں بھی آتش زیر پا
موئے آتش دیدہ ہے حلقہ میری زنجیر کا

دِل مرا سوزِ نہاں سے بے محابا جل گیا
آتشِ خاموش کی مانند گویا جل گیا

دِل میں ذوقِ وصل و یادِ یار تک باقی نہیں
آگ اس گھر کو لگی ایسی کہ جو تھا جل گیا

میں عدم سے بھی پرے ہوں ورنہ غافل بارہا
میری آہِ آتشیں سے بالِ عنقا جل گیا

عرض کیجئے جوہر اندیشہ کی گرمی کہاں
کچھ خیال آیا تھا وحشت کا کہ صحرا جل گیا

دل نہیں تجھ کو دکھاتا ورنہ داغوں کی بہار
اس چراغاں کا کروں کیا کارفرما جل گیا

میں ہوں اور افسردگی کی آرزو غالب کہ دل
دیکھ کر طرزِ تپاکِ اہلِ دنیا جل گیا

شب کہ برقِ سوزِ دل سے زہرۂ ابر آب تھا
شعلۂ جوالہ ہر اک حلقۂ گرداب تھا

فرش سے تا عرش واں طوفاں تھا موجِ رنگ کا
یاں زمیں سے آسماں تک سوختن کا باب تھا

جاتا ہوں داغِ حسرتِ ہستی لئے ہوئے
ہوں شمعِ کشتہ درخورِ محفل نہیں رہا

شمع بجھتی ہے تو اس میں سے دھواں اٹھتا ہے
شعلۂ عشق سیہ پوش ہوا میرے بعد

کیوں جل گیا نہ تابِ رخِ یار دیکھ کر
جلتا ہوں اپنی طاقتِ دیدار دیکھ کر

آتش پرست کہتے ہیں اہلِ جہاں مجھے
سرگرمِ نالہ ہائے شرر بار دیکھ کر

جلتا ہے دل کہ کیوں نہ ہم اک بار جل گئے
اے نا تمامیٔ نفسِ شعلہ بار حیف

یک نظر بیش نہیں فرصتِ ہستی غافل
گرمیٔ بزم ہے اک رقصِ شرر ہونے تک

غمِ ہستی کا اسدؔ کس سے ہو جز مرگ علاج
شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

اک شرر دل میں ہے اس سے کوئی گھبرائے گا کیا
آگ مطلوب ہے ہم کو جو ہوا کہتے ہیں

لپٹنا پرنیاں میں شعلۂ آتش کا آساں ہے
ولے مشکل ہے حکمت دل میں سوزِ غم چھپانے کی

اس شمع کی طرح سے جس کو کوئی بجھا دے
میں بھی جلے ہوؤں میں ہوں داغِ ناتمامی

تم اپنے شکوے کی باتیں نہ کھود کھود کے پوچھو
حذر کرو مرے دل سے کہ اس میں آگ دبی ہے

جی جلے ذوقِ فنا کی ناتمامی پر نہ کیوں
ہم نہیں جلتے نفس ہر چند آتش بار ہے

آگ سے پانی میں بجھتے وقت اُٹھتی ہے صدا
ہر کوئی درماندگی میں نالے سے ناچار ہے

رحم کر ظالم کہ کیا بودِ چراغِ کُشتہ ہے
نبضِ بیمارِ وفا دودِ چراغِ کشتہ ہے

دل لگی کی آرزو بے چین رکھتی ہے ہمیں
ورنہ یاں بے رونقی سودِ چراغِ کشتہ ہے

چشمِ خوباں خامشی میں بھی نوا پرواز ہے
سرمہ تو کہوے کہ دودِ شعلۂ آواز ہے

ڈھونڈے ہے اس مغنّیِ آتشِ نفس کو جی
جس کی صدا ہو جلوۂ برقِ فنا مجھے

جلوہ زارِ آتشِ دوزخ ہمارا دِل سہی
فتنۂ شورِ قیامت کس کی آب و گِل میں ہے

آتشِ دوزخ میں یہ گرمی کہاں
سوزِ غم ہائے نہانی اور ہے

آتش کدہ ہے سینہ مرا رازِ نہاں سے
اے وائے اگر معرضِ اظہار میں آوے

نگہ گرم سے اک آگ ٹپکتی ہے اسدؔ
ہے چراغانِ خس و خاشاکِ گلستاں مجھ سے

عشق پر زور نہیں ہے یہ وہ آتش غالبؔ
کہ لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے

نہ شعلے میں یہ کرشمہ نہ برق میں یہ ادا
کوئی بتاؤ کہ وہ شوخِ تند خو کیا ہے

سخن میں خامۂ غالبؔ کی آتش افشانی
یقین ہے ہم کو بھی لیکن اب اس میں دم کیا ہے

ان اشعار میں آگ ہی آگ ہے۔ کہیں یہ آگ عالم اسیری میں پاؤں کے نیچے آ کر ایک عالمِ اضطراب اور بے چینی کی کیفیت کو پیدا کرتی ہے کہیں اس کی وجہ سے حلقۂ زنجیر موئے آتش دیدہ کی

صورت اختیار کر لیتا ہے۔ کہیں وہ سوزِ نہاں سے دل کو بے محابا جلاتی ہے۔ کہیں آتشِ خاموش کی طرح دل کو جلانے کا عمل اس کے ہاتھوں مکمل ہوتا ہے۔ کہیں وہ گھر کو آگ لگاتی ہے اور ہر چیز کو جلا کر بھسم کر دیتی ہے۔ کہیں وہ آہ آتشیں سے بالِ عنقا کو جلاتی ہے۔ کہیں وہ جوہرِ اندیشہ کی گرمی کا روپ اختیار کرتی ہے کہیں وحشت کے خیال سے صحرا کو جلاتی ہے۔ کہیں اس کے اثر سے حلقۂ گرداب تک شعلۂ جوالہ بن جاتا ہے۔ کہیں وہ زمین سے آسمان تک سوختن کے باب کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ کہیں وہ نالہ ہائے شرر بار بن جاتی ہے۔ کہیں رقصِ شرر میں اس کا عکس نظر آتا ہے۔ کہیں وہ شمع کو جلاتی ہے اور کہیں اس کو شمع کشتہ بنا دیتی ہے۔ کہیں دل میں ایک شرر بن جاتی ہے۔ کہیں دل میں اپنے آپ کو دباتی ہے۔ کہیں نفس کو آتش بار بناتی ہے۔ کہیں پانی میں اپنے آپ کو رونما کرتی ہے۔ کہیں سوزِ غم ہائے نہانی کی وجہ سے سینے کو آتش کدہ بناتی ہے۔ کہیں نگہ گرم سے ٹپکتی ہے۔ کہیں وہ عشق بن جاتی ہے اور کہیں خامۂ غالب کی آتش فشانی کا روپ اختیار کر لیتی ہے۔ غرض اس طرح غالب کی شاعری میں آگ نے اَن گنت روپ اختیار کیے ہیں اور ان کے فن میں بعض ایسی تصویروں کو تخلیق کیا ہے جو ان کی رومانی مزاجی کو ظاہر کرتی ہیں اور جن کی وجہ سے اُن کے فن میں گرمی اور روشنی کا احساس ہوتا ہے۔

اس میں شبہ نہیں کہ غالب کی شاعری میں آگ اور اس

کے متعلقات کی تصویریں ایک عالمِ اضطراب کی پیداوار ہیں اور مزاج کی بے چینی کو ظاہر کرتی ہیں۔ اس اضطراب اور بے چینی کا وجود ان ناسازگار حالات کے نتیجے میں ہوا ہے جن میں غالب نے زندگی بسر کی ہے لیکن ان کے ساتھ لگاؤ اور اُس ولولہ و شوق نے پیدا کیا ہے جو ان کے مزاج کا لازمی جُز تھا۔ یہی وجہ ہے کہ آگ اور اس کے مُتعلقات ان کے یہاں ناسازگار حالات کی ترجمانی ہی نہیں کرتے۔ حُسن اور زندگی اور طاقت کی علامت بھی بن جاتے ہیں۔ اگر یہ صُورت نہ ہوتی تو وہ اس قسم کے شعر نہ کہتے ؎

نہ شعلے میں یہ کرشمہ نہ برق میں یہ ادا
کوئی بتاؤ کہ وہ شوخِ تند خو کیا ہے

ڈھونڈے ہے اُس مغنیِ آتش نفس کو جی
جس کی صدا ہو جلوۂ برقِ فنا مجھے

غالب یہاں شعلے میں ایک کرشمہ اور برق میں ایک ادا دیکھتے ہیں اور اس کرشمے اور ادا کو محبوبِ شوخ و تندخو کی اداؤں اور کرشموں کے ساتھ ایک مُناسبت پیدا کرتے ہیں۔ گویا ان دونوں چیزوں میں انہیں حسن نظر آتا ہے اور وہ ان میں زندگی محسوس کرتے ہیں۔ اسی طرح مغنیِ آتش نفس کی جو تصویر انہوں نے بنائی ہے اس سے بھی یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ان کے حواس اپنی تسکین بلکہ تکمیل کے لئے اس آتش نفسی کی تمنّا کرتے ہیں جو ان کے خیال میں

ایک متنّی کا طرۂ امتیاز ہے۔

غالب کی شاعری میں آگ کی تصویروں کے ساتھ ساتھ برق اور بجلی وغیرہ کی جو تصویریں ملتی ہیں ان سے بھی یہ بات صحیح ثابت ہوتی ہے کہ وہ ان چیزوں کو حسن اور زندگی اور طاقت کی علامت سمجھتے ہیں۔ برق اور بجلی کا تعلق بھی بہرحال کسی نہ کسی طرح آگ اور آتش سے ضرور ہے۔ غالب کو ان کے ساتھ بھی ایک ذہنی مناسبت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری میں ان کی تصویریں بھی جگہ جگہ ملتی ہیں۔ یہ اشعار دیکھئے ؎

مری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی
ہیولا برقِ خرمن کا ہے خونِ گرم دہقان کا

سراپا رہنِ عشق و ناگزیرِ الفت ہستی
عبادت برق کی کرتا ہوں اور افسوس حاصل کا

شب کہ برقِ سوزِ دل سے زہرۂ ابر آب تھا
شعلۂ جوالہ ہر اک حلقۂ گرداب تھا

گرنی تھی ہم پہ برقِ تجلّی نہ طور پر
دیتے ہیں بادہ ظرفِ قدح خوار دیکھ کر

غم نہیں ہوتا ہے آزادوں کو بیش از یک نفس
برق سے کرتے ہیں روشن شمعِ ماتم خانہ ہم

رونقِ ہستی ہے عشق خانہ ویراں ساز سے
انجمن بے شمع ہے گر برق خرمن میں نہیں

قفس میں مجھ سے رودادِ چمن کہتے نہ ڈر ہمدم
گری تھی جس پہ کل بجلی وہ میرا آشیاں کیوں ہو

نہ شعلے میں یہ کرشمہ نہ برق میں یہ ادا
کوئی بتاؤ کہ وہ شوخِ تند خو کیا ہے

غالب کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے برق خرمن ، برق کی عبادت برق سوزِ دل ، برق تجلّی ، برق سے کرتے ہیں روشن شمع ماتم خانہ ہم ، انجمن بے شمع ہے گر برق خرمن میں نہیں ، گری تھی جس پہ کل بجلی ، نہ شعلے میں یہ کرشمہ نہ برق میں یہ ادا وغیرہ کی تصویروں میں صرف برق اور بجلی ہی کی تصویریں نہیں بنائی ہیں ، اپنے تخیّل کے رنگوں سے کام لے کر کچھ اور تصویریں بھی بنائی ہیں جن کو تخیّل کی عینک ہی سے دیکھا جا سکتا ہے ۔

آگ ، آتش ، دھواں ، شرر ، برق اور بجلی کی تصویروں اور پیکروں کے ساتھ ساتھ غالب کی شاعری میں خون اور لہو وغیرہ کی

تصویریں اور پیکر بھی بہت نمایاں دکھائی دیتی ہیں۔ ان تصویروں کے عوامل اور محرکات بھی وہی ہیں جو آگ، آتش، برق اور بجلی وغیرہ کی تصویروں کے ہیں۔ غالبؔ نے انسانی زندگی کی ایک ایک بات پر اپنے دل کو خون کیا ہے، اس کے ایک ایک پہلو پر وہ خون کے آنسو روئے ہیں، اس کے ایک ایک نشیب و فراز پر انھوں نے خون کے دریاؤں کو موجزن دیکھا ہے، اور اس کے ایک ایک انقلاب پر انھوں نے خود خون کے دریا بہا دیے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ خون کی امیج یا تصویر ان کے مزاج کا جُز بن گئی ہے۔ اور وہ اس تصویر کو اپنے بعض اہم تجربات کی ترجمانی کے لئے استعمال کرنے پر مجبور ہو گئے ہیں۔ یہ دیکھئے کہ کیسے کیسے عجیب تجربات کو انھوں نے خون کی تصویریں بنا کر پیش کیا ہے ؎

غنچہ پھر لگا کھِلنے آج ہم نے اپنا دل
خوں کیا ہوا دیکھا گُم کیا ہوا پایا

دل تا جگر کہ ساحلِ دریائے خوں ہے اب
اس رہگزر میں جلوۂ گُل آگے گرد تھا

خموشی میں نہاں خوں گشتہ لاکھوں آرزوئیں ہیں
چراغِ مُردہ ہوں میں بے زباں گورِ غریباں کا

نہیں معلوم کس کس کا لہو پانی ہوا ہو گا
قیامت ہے سرشک آلودہ ہونا تیری مژگاں کا

جلوۂ گل نے کیا تھا واں چراغاں آب جو
یاں رواں مژگانِ چشم تر سے خونِ ناب تھا

ناگہاں اس رنگ سے خوں نابہ ٹپکانے لگا
دل کہ ذوقِ کاوشِ ناخن سے لذّت یاب تھا

ایک ایک قطرے کا مجھے دینا پڑا حساب
خونِ جگر ودیعتِ مژگانِ یار تھا

رگِ سنگ سے ٹپکتا وہ لہو کہ پھر نہ تھمتا
جسے غم سمجھ رہے ہو یہ اگر شرار ہوتا

پتے نذرِ کرم تحفہ ہے شرم نارسائی کا
بخوں غلطیدۂ صد رنگ دعویٰ پارسائی کا

نہ مارا جان کر بے جرم قاتل تیری گردن پر
رہا مانندِ خونِ بے گناہ حق آشنائی کا

باغ میں مجھ کو نہ لے جا ورنہ میرے حال پر
ہر گلِ تر ایک چشمِ خوں فشاں ہو جائے گا

زخم گر دب گیا لہو نہ تھما
کام گر رُک گیا روا نہ ہوا

بے خونِ دل ہے چشم میں موجِ نگہ غبار
یہ مے کدہ خراب ہے مے کے سُراغ کا

دردِ دل لکھوں کب تک جاؤں ان کو دکھلاؤں
اُنگلیاں فگار اپنی خامہ خوں چکاں اپنا

مقتل کو کس نشاط سے جاتا ہوں میں کہ ہے
پُر گُل خیالِ زخم سے دامن نگاہ کا

موجِ خوں سَر سے گذر ہی کیوں نہ جائے
آستانِ یار سے اُٹھ جائیں کیا

خوں ہے دل خاک میں احوالِ بتاں پر یعنی
اُن کے ناخن ہوئے محتاجِ حنا میرے بعد

ہے خونِ جگر جوش میں دل کھول کے روتا
ہوتے جو کئی دیدۂ خوں نابہ فشاں اور

اسدؔ بسمل ہے کس انداز کا قاتل سے کہتا ہے
کہ مشقِ ناز کو خونِ دو عالم میری گردن پر

عاشقی صبر طلب اور تمنّا بے تاب
دل کا کیا رنگ کروں خونِ جگر ہونے تک

ضعف سے اے گریہ کچھ باقی مرے تن میں نہیں
رنگ ہو کر اُڑ گیا جو خوں کہ دامن میں نہیں

میں اور صد ہزار نوائے جگر خراش
تو اور ایک وہ نہ شنیدن کہ کیا کہوں

خنجر سے چیر سینہ اگر دل نہ ہو دونیم
دل میں چھری چبھو مژہ گر خوں چکاں نہ ہو

نظر لگے نہ کہیں اُس کے دست و بازو کو
یہ لوگ کیوں مرے زخمِ جگر کو دیکھتے ہیں

جو نے خوں آنکھوں سے بہنے دو کہ ہے شامِ فراق
میں یہ سمجھوں گا کہ شمعیں دو فروزاں ہو گئیں

وفا کیسی کہاں کا عشق جب سر پھوڑنا ٹھہرا
تو پھر اے سنگدل تیرا ہی سنگِ آستاں کیوں ہو

نہ اتنا بُرّشِ تیغِ جفا پر ناز فرماؤ
مرے دریائے بیتابی میں ہے اک موجِ خوں وہ بھی

انہیں منظور اپنے زخمیوں کا دیکھ آنا تھا
اُٹھے تھے سیرِ گُل کو دیکھنا شوخی بہانے کی

حالانکہ ہے یہ سیلیِ خارا سے لالہ رنگ
غافِل کو میرے شیشے پہ مے کا گُمان ہے

عمر ہر چند کہ ہے برقِ خرام
دِل کے خوں کرنے کی فُرصت ہی سہی

شق ہو گیا ہے سینہ خوشا لذّتِ فراغ
تکلیفِ پردہ داریِ زخمِ جگر گئی

پھر جگر کھودنے لگا ناخن
آمدِ فصلِ لالہ کاری ہے

لکھتے رہے جنوں کی حکایاتِ خوں چکاں
ہر چند اِس میں ہاتھ ہمارے قلم ہوئے

چپک رہا ہے بدن پر لہو سے پیراہن
ہماری جیب کو اب حاجتِ رفو کیا ہے

رگوں میں دوڑنے پھرنے کے ہم نہیں قائل
جو آنکھ ہی سے نہ ٹپکا تو پھر لہو کیا ہے

خلشِ غمزۂ خوں ریز نہ پوچھ
دیکھ خونابہ فشانی میری

ہے موجزن اک قلزمِ خوں کاش یہی ہو
آتا ہے ابھی دیکھیے کیا کیا مرے آگے

خوں ہو کے جگر آنکھ سے ٹپکا نہیں اے مرگ
رہنے دے مجھے یاں کہ ابھی کام بہت ہے

پھر بھر رہا ہے خامۂ مژگاں بہ خونِ دل
سازِ چمن طرازیٔ داماں کیئے ہوئے

غالب نے ان اشعار میں اپنے متنوّع تجربات کی ترجمانی کی ہے لیکن ان میں سے ہرایک کا اظہار خون کے بیان سے ہوا ہے۔ ان میں سے بعض اشعار کا موضوع ہی خون ہے لیکن بعض ایسے ہیں جن کا موضوع خون نہیں ہے لیکن اظہار کے لئے خون کے تصوّر کو استعمال کیا گیا ہے۔ اس طرح ان میں سے ہر ایک شعر کسی نہ کسی زاویے سے خون کی تصویر کو پیش کرتا ہے۔ یہ خون کی تصویر احساس اور جذبے کی شدّت اور فکر کی گہرائی اور انسان کے انفرادی اور اجتماعی معاملات کے گہرے شعور کو ظاہر کرتی ہیں۔ اور پڑھنے والے کے حواس پر براہِ راست اُن کا اثر ہوتا ہے۔ لیکن ان تصویروں کو پیش کرنے اور پیکروں کو تراشنے میں غالب کی کوئی شعوری کوشش شامل نہیں ہے۔ ان کے مخصوص مزاج اور مخصوص اُفتادِ طبع نے ان سے ان تصویروں کی تخلیق کرائی ہے۔

یہ تو غالب کے ایسے اشعار ہیں جن میں براہِ راست خون کی امیج یا تصویر اور پیکر ابھر کر سامنے آتے ہیں لیکن ان کی شاعری میں بعض اشعار ایسے بھی ملتے ہیں جن میں بات تو خون کی نہیں ہے لیکن جن میں سے مجموعی طور پر خون کی تصویر ضرور اُبھرتی ہے اور کم و بیش وہی اثر کرتی ہے جو ایسے

اشعار کرتے ہیں جن میں براہِ راست خون کی تصویریں نمایاں ہوتی ہیں - یہ اشعار اسی میلان کے ترجمان ہیں

گرچہ ہوں دیوانہ پر کیوں دوست کا کھاؤں فریب
آستیں میں دشنہ پنہاں ہاتھ میں خنجر کھلا

دوست غمخواری میں میری سعی فرمائیں گے کیا
زخم کے بڑھنے تلک ناخن نہ بڑھ آئیں گے کیا

آج واں تیغ و کفن باندھے ہوئے جاتا ہوں میں
عذر میرے قتل کرنے میں وہ اب لائیں گے کیا

کوئی میرے دل سے پوچھے تیرے تیرِ نیم کش کو
یہ خلش کہاں سے ہوتی جو جگر کے پار ہوتا

ہم کہاں قسمت آزمانے جائیں
تو ہی جب خنجر آزما نہ ہوا

محابا کیا ہے میں ضامن ادھر دیکھ
شہیدانِ نگہ کا خوں بہا کیا

اِن آبلوں سے پاؤں کے گھبرا گیا تھا میں
جی خوش ہوا ہے راہ کو پُر خار دیکھ کر

میں اور صد ہزار نوائے جگر خراش
تو اور ایک وہ نہ شنیدن کہ کیا کہوں

خنجر سے چیر سینہ اگر دِل نہ ہو دو نیم
دِل میں چھُری چبھو مِژہ گر خوں چکاں نہ ہو

نظر لگے نہ کہیں اس کے دست و بازو کو
یہ لوگ کیوں مِرے زخمِ جگر کو دیکھتے ہیں

وفا کیسی کہاں کا عشق جب سر پھوڑنا ٹھہرا
تو پھر اے سنگدل تیرا ہی سنگِ آستاں کیوں ہو

حالانکہ ہے یہ سیلیٔ خارا سے لالہ رنگ
غافل کو میرے شیشے پہ مے کا گُماں ہے

انہیں منظور اپنے زخمیوں کو دیکھ آنا تھا
اُٹھے تھے سیرِ گل کو دیکھنا شوخی بہانے کی

شق ہو گیا ہے سینہ خوشا لذتِ فراغ
تکلیفِ پردہ داریٔ زخمِ جگر گئی

پھر جگر کھودنے لگا ناخن
آمدِ فصلِ لالہ کاری ہے

ان اشعار میں آستین میں دشنہ پنہاں، ہاتھ میں خنجر کھلا، زخم کے بڑھنے تلک ناخن نہ بڑھ آئیں گے کیا، عذر میرے قتل کرنے میں وہ اب لائیں گے کیا، یہ خلش کہاں سے ہوتی جو جگر کے پار ہوتا، صد ہزار نوائے جگر خراش، خنجر سے چیر سینہ، دل میں چھری چبھو، یہ لوگ کیوں مرے زخمِ جگر کو دیکھتے ہیں، جب سر پھوڑنا ٹھہرا، سیلیٔ خار سے لالہ رنگ، اپنے زخمیوں کا دیکھ آنا، شق ہو گیا ہے سینہ، وغیرہ کا جو بیان ہے اس میں کہیں نہ کہیں، کسی نہ کسی طرح خون کی تصویر ضرور سامنے آتی ہے اور حواس پر وہی اثر کرتی ہے جو خون کی تصویروں والے اشعار کرتے ہیں۔

غالب نے بعض بڑی دل کش اور دلآویز تصویروں اور پیکروں کی تخلیق تلمیحات اور تشبیہات و استعارات کے سہارے بھی کی ہے۔ عام طور پر تلمیحات اور تشبیہات و استعارات کو کلام کا زیور سمجھا جاتا ہے۔ لیکن غالب کی شاعری میں ان چیزوں کا یہ تصوّر نہیں ہے۔ ان کے خیال میں تو ان کا مقصد اظہار و ابلاغ ہے۔ چنانچہ وہ اسی مقصد سے ان کو استعمال کرتے ہیں اور اس میں شبہ نہیں کہ

غالب نے اظہار و ابلاغ میں ان تلمیحات اور تشبیہات و استعارات سے بڑا کام لیا ہے۔ تخیل نے ان میں بڑی زندگی اور جولانی پیدا کی ہے اور ساتھ ہی ان کو رنگین اور پُرکار بھی بنایا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی تلمیحات اور تشبیہات و استعارات میں احساسِ جمال کی تسکین کا بھی خاصا سامان موجود ہے۔

پہلے تلمیحات کو دیکھئے۔ یہ اشعار کیسے رنگین اور پُرکار ہیں اور کیسی جان دار اور زندگی سے بھرپور تصویروں اور پیکروں کو آنکھوں کے سامنے لاکر کھڑا کر دیتے ہیں ؎

تیشے بغیر مر نہ سکا کوہکن اسدؔ
سرگشتۂ خمارِ رسوم و قیود تھا

ہم سخن تیشے نے فرہاد کو شیریں سے کیا
جس طرح کا کہ کسی میں ہو کمال اچھا ہے

شوق ہر رنگ رقیبِ سر و ساماں نکلا
قیس تصویر کے پردے میں بھی عریاں نکلا

مر گیا صدمۂ یک جنبشِ لب سے غالبؔ
ناتوانی سے حریفِ دمِ عیسیٰ نہ ہوا

کیا وہ نمرود کی خدائی تھی
بندگی میں مرا بھلا ہوا

میں نے مجنوں پہ لڑکپن میں اسدؔ
سنگ اٹھایا تھا کہ سر یاد آیا

گرنی تھی ہم پہ برقِ تجلّی نہ طور پر
دیتے ہیں بادہ ظرفِ قدح خوار دیکھ کر

سلطنت دست بدست آئی ہے
جامِ مے خاتمِ جمشید نہیں

قید میں یعقوب نے لی گو نہ یوسف کی خبر
لیکن آنکھیں روزنِ دیوارِ زنداں ہوگئیں

عشق و مزدوریٔ عشرت گہِ خسرو کیا خوب
ہم کو تسلیم نکو نامیٔ فرہاد نہیں

سب رقیبوں سے ہوں ناخوش پر زنانِ مصر سے
ہے زلیخا خوش کہ محوِ ماہِ کنعاں ہوگئیں

دستگاہِ دیدۂ خونبارِ مجنوں دیکھنا
یک بیاباں جلوۂ گُل فرشِ پا انداز ہے

بے صَرفہ ہی گُزرتی ہے ہو گرچہ عمرِ خضر
حضرت بھی کل کہیں گے کہ ہم کیا کیا کیے

لازم نہیں کہ خضر کی ہم پیروی کریں
جانا کہ اک بزرگ ہمیں ہم سفر ملے

ہم سخن تیشے نے فرہاد کو شیریں سے کیا
جس طرح کا بھی کسی میں ہو کمال اچھا ہے

قد و گیسو میں قیس و کوہکن کی آزمائش ہے
جہاں ہم ہیں، وہاں دار و رسن کی آزمائش ہے

اک کھیل ہے اورنگِ سلیماں مرے نزدیک
اک بات ہے اعجاز مسیحا مرے آگے

کیا کیا خضر نے سکندر سے
اب کسے رہنما کرے کوئی

ان اشعار میں تلمیحات کا استعمال محض روایتی انداز میں نہیں ہوا ہے اور یہ تلمیحات صرف ان تصویروں اور پیکروں ہی کو نمایاں نہیں کرتیں جن کو عام طور پر فارسی اور اردو غزل کی روایت میں نمایاں کیا گیا ہے۔ ان میں تو ان تمام تصویروں اور پیکروں کے ساتھ غالب نے کچھ اور تصویروں اور پیکروں کو بھی اُبھارا ہے۔ مثلاً کوہکن کی مثالی تصویر ان اشعار میں نہیں اُبھرتی۔ غالب اس کی مثالی تصویر کے بجائے ان تصویروں کو ابھارتے ہیں کہ وہ خمارِ رسوم و قیود کا سرگشتہ تھا۔ اس لئے بغیر تیشے کے نہ مر سکا۔ لیکن پھر یہ تصویر ان کے سامنے آتی ہے کہ تیشہ ہی اس کے لئے سب کچھ تھا۔ تیشے ہی کی بدولت اسے شیریں سے ہم کلام ہونے کی توفیق عطا ہوئی۔ اسی طرح قیس کے بیان میں قیس سے زیادہ شوق اور اس کی بے سروسامانی یا اس سے ہمدردی کی تصویر زیادہ اُبھرتی ہے۔ کم و بیش یہی صورت ان اشعار کی ہے جن میں یعقوب، خضر، سکندر، سلیمان، یوسف اور زلیخا وغیرہ کا ذکر ہے کہ ان میں ان کی مخصوص روایتی تصویروں کے علاوہ غالب بعض ایسی تصویروں اور پیکروں کو بھی اُبھارتے ہیں جن میں ان کے نئے احساس و شعور کا رنگ نسبتاً زیادہ نمایاں نظر آتا ہے۔

کم و بیش یہی حال ان تصویروں اور پیکروں کا ہے جو غالب کی شاعری میں تشبیہات و استعارات کے وسیلے سے پیدا ہوتی ہیں۔ ان میں بھی غالب اپنی شخصیت کے مخصوص رنگ و آہنگ کو زیادہ نمایاں کرتے ہیں اور ان کے احساس و شعور کی رنگ آمیزی

ان میں نئے پہلوؤں کو پیدا کر کے نئی تصویروں کو ابھارتی ہے۔ غالب کے تخیل کی بلندی اور بلند پروازی ان تصویروں میں نئے نئے رنگ بھرتی ہے اور ان کے خطوط میں تیکھا پن پیدا کر کے ان میں نئی زندگی دوڑاتی ہے ؂

ان اشعار سے اس کا اندازہ ہوگا ؂

نقش فریادی ہے کس کی شوخیٔ تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا

بس کہ ہوں غالب اسیری میں بھی آتش زیرِ پا
موئے آتش دیدہ ہے حلقہ مری زنجیر کا

دل مرا سوزِ نہاں سے بے محابا جل گیا
آتشِ خاموش کی مانند گویا جل گیا

دِل تا جگر کہ ساحلِ دریائے خوں ہے اب
اس رہگذر میں جلوۂ گل آگے گرد تھا

رگِ سنگ سے ٹپکتا وہ لہو کہ پھر نہ تھمتا
جسے غم سمجھ رہے ہو وہ اگر شرار ہوتا

کیا آئینہ خانے کا وہ نقشہ تیرے جلوے نے
کرے جو پرتوِ خورشید عالم شبنمستان کا

خموشی میں نہاں خوں گشتہ لاکھوں آرزوئیں ہیں
چراغِ مردہ ہوں میں بے زباں گورِ غریباں کا

ہنوز اک پرتوِ نقشِ خیالِ یار باقی ہے
دلِ افسردہ گویا حجرہ ہے یوسف کے زنداں کا

ہیں بس کہ جوشِ بادہ سے شیشے اُچھل رہے
ہر گوشۂ بساط ہے سرِ شیشہ باز کا

شب ہوئی پھر انجمِ رخشندہ کا منظر کھلا
اس تکلف سے کہ گویا بت کدے کا در کھلا

نالۂ دل نے دیئے اوراقِ لختِ دل بہ باد
یادگارِ نالہ اک دیوانِ بے شیرازہ تھا

کوئی ویرانی سی ویرانی ہے
دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا

بجلی اک کوند گئی آنکھوں کے آگے تو کیا
بات کرتے کہ میں لب تشنۂ تقریر بھی تھا

جب تک کہ نہ دیکھا تھا قدِ یار کا عالم
میں معتقدِ فتنۂ محشر نہ ہوا تھا

جاتا ہوں داغِ حسرتِ ہستی لیے ہوئے
ہوں شمع کشتہ درخورِ محفل نہیں رہا

لوگوں کو ہے خورشیدِ جہاں تاب کا دھوکا
ہر روز دکھاتا ہوں میں اک داغِ نہاں اور

نہ گلِ نغمہ ہوں نہ پردۂ ساز
میں ہوں اپنی شکست کی آواز

اک نظر بیش نہیں فرصتِ ہستی غافل
گرمیٔ بزم ہے اک رقصِ شرر ہونے تک

غمِ ہستی کا اسدؔ کس سے ہو جز مرگ علاج
شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

برشگالِ دیدۂ عاشق ہے دیکھا چاہیے
کھل گئی مانند گل سو جا سے دیوارِ چمن

جہاں تیرا نقشِ قدم دیکھتے ہیں
خیاباں خیاباں ارم دیکھتے ہیں

جوئے خوں آنکھوں سے بہنے دو کہ ہے شام فراق
میں یہ سمجھوں گا کہ شمعیں دو فروزاں ہو گئیں

یہ کس بہشت شمائل کی آمد آمد ہے
کہ غیرِ جلوۂ گل رہگذر میں خاک نہیں

جب وہ جمالِ دلفروز صورتِ مہرِ نیم روز
آپ ہی ہو نظارہ سوز پردے میں منہ چھپائے کیوں

اُس شمع کی طرح سے جس کو کوئی بجھا دے
میں بھی جلے ہوؤں میں ہوں داغِ نا تمامی

چشمِ خوباں خامشی میں بھی نوا پرداز ہے
سرمہ تو کہوے کہ دودِ شعلۂ آواز ہے

سایہ میرا مجھ سے مثلِ دود بھاگے ہے اسد
پاس مجھ آتش بجاں کے کس سے ٹھہرا جائے ہے

کارگاہِ ہستی میں لالہ داغ سامان ہے
برقِ خرمنِ راحت خونِ گرمِ دہقان ہے

جلوہ زارِ آتشِ دوزخ ہمارا دِل سہی
فتنۂ شورِ قیامت کِس کی آب و گِل میں ہے

دیکھو تو دلفریبیٔ اندازِ نقشِ پا !
موجِ خرامِ یار بھی کیا گل کتر گئی

آتشِ دوزخ میں یہ گرمی کہاں
سوزِ غمہائے نہانی اور ہے

سیاہی جیسے گر جائے دمِ تحریر کاغذ پر
مری قسمت میں یوں تصویر ہے شب ہائے ہجراں کی

یا شب کو دیکھتے تھے کہ ہر گوشۂ بساط
دامانِ باغباں و کفِ گل فروش ہے

لطفِ خرامِ ساقی و ذوقِ صدائے چنگ
یہ جنتِ نگاہ وہ فردوسِ گوش ہے

نہ شعلے میں یہ کرشمہ نہ برق میں یہ ادا
کوئی بتاؤ کہ وہ شوخِ تند خُو کیا ہے

نہیں نگار کو اُلفت نہ ہو نگار تو ہے
روانیٔ روشِ و مستیٔ ادا کہئے

یہ اشعار جن بے شمار تصویروں کو پیش کر رہے ہیں وہ منہ سے بول رہی ہے۔ یہ تصویریں نئی ہیں۔ ان میں نئی زندگی ہے، نیا لہو ہے، نئے رنگ ہیں، نئے خطوط ہیں، یہ متحرک ہیں، ان میں تہ داری کی کیفیت ہے۔ یہ نہ جانے کیا کیا کچھ کہتی ہیں۔ اور نہ جانے کن کن زاویوں سے حواس پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ اور یہ سب کچھ اس وجہ سے ہے کہ یہ غالب کے نئے احساس اور نئے شعور کی تخلیق ہیں۔ غالب نے ان کے ہر رنگ میں جلوۂ صد رنگ پیدا کر دیا ہے۔

غرض جہاں تک تصویر کاری اور پیکر تراشی یا امیجری کا تعلق ہے غالب ایک پہلو دار فن کار ہیں۔ انہوں نے جن تصویروں کی تخلیق کی ہے ان میں بڑی زندگی ہے۔ وہ بڑی جان دار ہیں۔ ان میں جولانی اور تازگی کا احساس بھی ہوتا ہے۔ وہ چلتی پھرتی، اور بولتی

ہوئی نظر آتی ہیں ۔ ان تصویروں میں یک رنگی نہیں بلکہ رنگا رنگی ہے ۔ ان میں بڑا تنوّع ہے ۔ بڑی وسعت اور ہمہ گیری ہے ۔ غالبؔ کی شخصیت اور ان کے ماحول نے ان تصویروں کی تخلیق کی ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ ان میں بڑی گہرائی کا احساس ہوتا ہے ۔ یہ گہرائی غالب کے انفرادی اور اجتماعی تجربات کے صحیح جمالیاتی اظہار کی مرہونِ منت ہے ۔ غالب کے تخیّل نے ان تصویروں کو رنگین اور پُرکار بنانے میں بڑا کام کیا ہے اور ان میں سے ہر ایک میں کچھ ایسے رنگ بھرے ہیں جو حد درجہ جاذبِ نظر ہیں ۔ ان تصویروں کا اثر براہِ راست حواس پر ہوتا ہے اور ان میں انسان کے تمام حواس کو متاثر کرنے کی بڑی صلاحیت ہے ۔ غالب محسوسات کے شاعر ہیں اور حسّیاتی کیفیت کے اثرات ان کی شاعری میں بہت نمایاں ہیں ۔ یہ تصویریں اس حسّیاتی کیفیت میں شدّت پیدا کرتی ہیں اور اس طرح ان کے ہاتھوں احساسِ جمال کی تسکین کا بڑا سامان پیدا ہوتا ہے ۔

غالب کی شاعرانہ فن کاری میں جو رعنائی ہے اُس کی بُنیاد ان کی یہی تصویر کاری ، پیکر تراشی یا امیجری ہے ۔ وہ زندگی کے شاعر ہیں ۔ اور اس زندگی کے مختلف اور متنوع پہلوؤں کی ترجمانی ان کی شاعری کا خاص میدان ہے ۔ اس ترجمانی کی بُنیاد ان کا احساس اور شعور ہے ۔ اس احساس و شعور کے ارتعاش ہی کا نام ان کی شاعری ہے ۔ غالب نے اس ارتعاش کو ان بے شمار تصویروں اور پیکروں میں مجسّم کر دیا ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری اور ان تصویروں اور

پیکروں کا ایک حسین نگارخانہ ہے۔ غالب نے ان تصویروں کا خام مواد اپنے نجی معاملات، آس پاس اور گرد و پیش کے حالات معاشرتی اور تہذیبی روایات، اور ذہنی و فکری تجربات سے حاصل کیا ہے۔ اور اپنے تخیل سے خاطر خواہ کام لے کر اُن تصویروں میں جان ڈال دی ہے جو ان کے تجربات کے ہاتھوں تیار ہوئی ہیں۔ سی ڈے لیوس نے لکھا ہے کہ ایک شاعر کسی بھی چیز کو سامنے رکھ کر حسین سے حسین تصویروں کی تخلیق کر سکتا ہے بشرطیکہ وہ چیز اس کے تخیل کو پوری قوت سے حرکت میں لا کر اس سے خاطر خواہ کام لے سکے۔ غالب کی تصویر کاری پر یہ قول صادق آتا ہے۔ انہوں نے زندگی کی معمولی چیزوں کو تصویروں اور پیکروں کا روپ دیا ہے۔ لیکن اپنے تخیل سے، جس کی ان کے پاس فراوانی تھی، کام لے کر ان میں زندگی کی لہر دوڑا دی ہے۔

یہ تخیل شاعری کے لئے ایک دولت بیش بہا ہے۔ یہ ایک بہت بڑی طاقت ہے جو شاعری میں گرمی اور روشنی کو پیدا کرتی ہے۔ کولرج نے اس کو شاعری کی بنیاد قرار دیا ہے۔ اور اس پر فلسفیانہ بحث کی ہے۔ شیلے کے خیال میں تخیل ایک دیوتا ہے جس کی پرستش ہر شاعر کے لئے ضروری ہے۔ سی۔ڈی۔لیوس نے لکھا ہے کہ وہ صلاحیت جو شاعری میں تصویروں اور پیکروں کی تخلیق کرتی ہے اور ان کو دوسروں تک پہنچاتی ہے وہ شاعر کا تخیل ہے۔ غالب نے اس تخیل کو اپنی شاعرانہ فن کاری میں بڑے سلیقے سے استعمال کیا ہے۔ اور اس سے بڑے بڑے کام لئے

ہیں ۔ خاص طور پر ان کی تصویر کاری اور امیجری میں یہ تخیل نئے نئے زاویوں سے اپنے آپ کو رونما کرتا ہے۔ اس تخیل کے صحیح اور مناسب استعمال ہی کا یہ اثر ہے کہ ان کی تصویروں میں شدت اور جولانی کے عناصر اتنے نمایاں دکھائی دیتے ہیں اور اسی تخیل ہی کے اثر سے ان کی تصویروں اور پیکروں میں پڑھنے والوں کو متاثر کرنے کی صلاحیت بیدار ہوتی ہے اور یہ تینوں چیزیں ایسی ہیں جو بقول ڈے لیوس اعلیٰ درجے کی تصویر کاری اور بلند پایہ پیکر تراشی کے لئے ضروری ہیں۔

گوئٹے نے ایک جگہ اپنی تصویر کاری اور پیکر تراشی کے بارے میں لکھا ہے کہ شاعرانہ تصویریں اس کے یہاں تاثر کے نتیجے میں پیدا ہوئیں ۔ لیکن وہ صرف تاثر ہی تک محدود ہو کر نہیں رہ گئیں۔ ان تاثرات نے اس کی ذات کے اندر سینکڑوں قسم کے روپ اختیار کئے ۔ مثلاً حسیاتی ، زندگی اور جولانی سے بھرپور ، حسین اور خوب صورت ، بے شمار رنگوں میں رنگے ہوئے اور ان تمام تاثرات کو تخیل کی طاقت نے مختلف صورتوں میں پیش کیا۔ اور انہوں نے شاعرانہ تصویر کاری اور پیکر تراشی کی صورت اختیار کر لی ۔

غالب کی تصویر کاری پر بھی گوئٹے کی یہ بات صادق آتی ہے۔ انکی تصویر کاری اور پیکر تراشی کا تخلیقی عمل بھی کم و بیش اسی طرح جاری رہا ہے اسی لئے جہانتک تصویر کاری کا تعلق ہے وہ گوئٹے کے ہمنوا معلوم ہوتے ہیں اور ان دونوں میں بڑی حد تک ایک مماثلت پائی جاتی ہے ۔

زبان و بیان

شاعری میں سارا کھیل زبان کا ہوتا ہے بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہے کہ شاعری زبان ہی زبان ہے اور زبان کے سوا کچھ نہیں۔ زبان ہی سے شاعری میں تجربات اظہار و ابلاغ کی صورت اختیار کرتے ہیں۔ زبان ہی سے وزن و آہنگ، ترنم اور موسیقیت کی تخلیق ہوتی ہے۔ زبان ہی سے علامتوں اور اشاروں کا وجود ہوتا ہے۔ زبان ہی امیجری یا تصویر کاری کو زندگی دیتی ہے۔ غرض شاعری میں زبان اَن گنت کام کرتی ہے اور اس میں بے شمار پہلو اس کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں۔اور زبان الفاظ کے نظام کا نام ہے۔ الفاظ جب انسان کے کسی خاص تجربے کے تحت ایک مخصوص صورت اختیار کرتے ہیں تو شاعری وجود میں آتی ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ شاعری کی بنیاد جذبات و احساسات اور افکار و خیالات

ہیں جن کو شاعر اپنے تجربات کی شکل میں پیش کرتا ہے۔ لیکن یہ تجربات اسی وقت شاعری کہلائے جانے کے قابل ہوتے ہیں جب ان کا اظہار، تازہ، شگفتہ، شاداب، مترنم اور ہیرے کی طرح ترشی ہوئی زبان میں ہوتا ہے۔

غالب کی شاعری اس معیار پر پوری اترتی ہے۔ ان کے فن میں زبان کو نمایاں مقام حاصل ہے۔ وہ زبان کے بلند پایہ فن کار ہیں۔ اور اس میں شبہ نہیں کہ انھوں نے زبان کے استعمال کو ایک فن بنا دیا ہے۔ انھوں نے اپنی شاعری میں جمالیاتی اظہار کے لئے جو زبان استعمال کی ہے وہ زندگی سے بھرپور ہے۔ اس میں بڑی جولانی ہے۔ بڑی جدت اور تازگی ہے۔ بڑی ہی شگفتگی اور شادابی ہے۔ بڑی ہی رنگینی اور پرکاری ہے۔ غالب نے اس کو خوب بنایا، سنورا اور نکھارا ہے اور اس میں شروع سے آخر تک ایک ہیرے کی طرح ترشی ہوئی کیفیت پیدا کردی ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ غالب نے زبان کی صناعی ہی کو اپنے پیش نظر رکھا ہے۔ صرف صناعی ان کے یہاں نہیں ہے۔ وہ اس کے قائل بھی نہیں ہیں۔ اُن کی زبان تو ان کے تخلیقی مزاج کی آئینہ دار ہے۔ وہ ان کی شاعری کے مواد کے ساتھ مناسبت رکھتی ہے۔ وہ ان کے تجربات کے ساتھ پوری طرح ہم آہنگ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے رنگ و آہنگ میں ان کی شخصیت اور مزاج کا عکس صاف نظر آتا ہے اور ان کی طبیعت کی تخلیقی کیفیت اپنی تمام جلوہ سامانیوں کے ساتھ

اس میں بے نقاب نظر آتی ہے۔

غالب نے زبان کو ایک نیا مزاج دیا ہے۔ اس کے استعمال میں ایک اجتہادی شان پیدا کی ہے۔ اور اس اعتبار سے وہ ایک منفرد حیثیت رکھتے ہیں۔ غالب سے قبل جو زبان شاعری کے لیے استعمال ہوتی تھی، وہ اس زمانے کے لحاظ سے تو مناسب تھی لیکن ان کے زمانے تک آتے آتے فن کے تقاضے مختلف ہو گئے تھے۔ چنانچہ زبان کے استعمال میں نمایاں تبدیلیاں ہو چکی تھیں اور ان تبدیلیوں کی وجہ سے ان میں ایک نیا مزاج پیدا ہو گیا تھا۔ اس نئے مزاج کو پیدا کرنے میں غالب کی شاعری اور فن کو نمایاں حیثیت حاصل ہے اور اس اعتبار سے ان کے فن کی حیثیت ایک رجحان بلکہ ایک تحریک کی ہے۔

شاعری کی زبان کا جو انداز غالب سے قبل تھا، اس کی صحیح نمائندگی ایک طرف تو میرؔ اور سوداؔ کرتے ہیں اور دوسری طرف انشاؔ، جرأتؔ اور مصحفیؔ۔ یوں میرؔ اور سوداؔ کی زبان بھی ایک دوسرے سے مختلف ہے اور انشاؔ، جرأتؔ اور مصحفیؔ میں بھی، جہاں تک شاعری میں زبان کے استعمال کا تعلق ہے، خاصا اختلاف نظر آتا ہے لیکن یہ اختلافات دراصل محدود ہیں اور ان میں سے ہر ایک شاعر کی شاعرانہ انفرادیت کو ظاہر کرتا ہے۔ لیکن مجموعی طور پر دیکھا جائے تو میرؔ اور سوداؔ نے جو زبان شاعری کے لئے استعمال کی ہے اس میں ایک خاص مزاج ملتا ہے۔ اس میں سادگی اور سلاست ہے۔ ایک سیدھا سادہ انداز ہے۔

وہ شیشے کی طرح صاف اور شفاف ہے۔ اس میں رنگینی اور پُرکاری نسبتاً کم ہے۔ اس میں وہ رچاؤ بھی کم ہے جو کسی زبان میں وقت کے ساتھ ساتھ پیدا ہوتا ہے۔ اس میں فارسی زبان کے اثرات موجود ہیں۔ لیکن ہندی کے اثرات بھی اس میں کچھ کم نہیں ہیں۔ اور ان دونوں اثرات نے مل کر اس میں ایک چاشنی کی کیفیت پیدا کر دی ہے۔ برخلاف اس کے انشاؔ، جرأتؔ اور مصحفیؔ کی استعمال کی ہوئی زبان میں نسبتاً زیادہ پُرکاری ہے۔ اس میں سادگی اور سلاست کا رنگ زیادہ گہرا نہیں ہے۔ اس میں فارسی کی روایت کے اثرات نسبتاً زیادہ نمایاں ہیں۔ اس میں کسی قدر صناعی کا احساس بھی ہوتا ہے۔ لیکن اس صناعی میں زیادہ باقاعدگی کا پتہ نہیں چلتا۔ برخلاف اس کے زبان کو بنانے اور سنوارنے کے معاملے میں کسی حد تک ایک طرح کی بے نیازی سی نظر آتی ہے۔

ان میں انشاؔ، اِس میں شبہ نہیں، کہ زبان کے بہت بڑے مزاج داں تھے لیکن جن حالات میں سے ہو کر ان کی زندگی کا قافلہ گذرا انہوں نے ان کی اس مزاج دانی کو ایسے راستوں پر بھی ڈال دیا جو غیر سنجیدگی بلکہ ابتذال کی منزل کی طرف جاتے تھے۔ جرأتؔ کی ذہنی سطح ذرا نیچی تھی۔ اس لئے وہ شاعری کی زبان میں کوئی ایسا رجحان پیدا نہ کر سکے جو فنی، جمالیاتی یا لسانیاتی اعتبار سے قابلِ ذکر ہو۔ ان کی شاعری میں معاملہ بندی تھی۔ اسی لئے ان کی زبان میں بھی وہ رنگ و آہنگ نظر آتا ہے جو معاملہ بندی کے ساتھ مخصوص ہے۔ مصحفیؔ بے شک، ان میں ایسے شاعر ہیں، جن

کے یہاں زبان کے معاملے میں زیادہ سنجیدگی اور باقاعدگی کا احساس ہوتا ہے اور وہ زبان کو نیا رنگ و آہنگ دینے میں نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔ مجموعی طور پر دیکھا جائے تو ان شاعروں کے اثر سے شاعری کی زبان ایک نئی صورت اختیار کرتی ہوئی نظر آتی ہے۔

یہ شاعر غالب کے ہم عصر تھے۔ لیکن جس وقت ان کے فن کا شباب تھا، اس وقت غالب کا فن بچپن کی منزلیں طے کر رہا تھا۔ اس لئے ان شاعروں نے شاعری کی زبان اور اس کے استعمال میں جو رُجحانات پیدا کئے، وہ بہر صورت غالب کے پیش نظر رہے۔ اور کسی نہ کسی حد تک، شعوری طور پر یا غیر شعوری طور پر، انہوں نے زبان کی اس بدلتی ہوئی کیفیت کا اثر قبول کیا۔ پھر سب سے بڑی بات یہ ہوئی کہ ان کے خاص ہم عصروں میں سے ناسخ نے اصلاح زبان کی ایک تحریک چلا دی اور عملی طور پر شاعری کی زبان کو سنوارنے اور نکھارنے کی کوشش کی اور اس کی نوک پلک کو درست کیا۔ یہ اور بات ہے کہ خیال، موضوع اور مواد سے رشتہ توڑ لینے کی وجہ سے زبان نے ان کے یہاں صرف صناعی کی صورت اختیار کر لی۔ اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ شاعری بندش الفاظ اور بندش الفاظ نگوں کے جڑنے کے مترادف سمجھی گئی اور اس کو ایک مرصع ساز کا کام تصور کر لیا گیا۔

غالب اپنے زمانے کے ان رجحانات اور میلانات سے کسی نہ کسی حد تک ضرور متاثر ہوئے۔ اس کا ایک بہت واضح ثبوت تو یہ ہے کہ ان کے فن پر ایک دور ایسا بھی گذرا ہے جب انہوں

نے ناسخ کا تتبع کیا ہے، اور ایسے اشعار بھی کہے ہیں جو ناسخ کے اشعار کے ساتھ مماثلت رکھتے ہیں۔ میرؔ کی اہمیت کا انہوں نے خود اعتراف کیا ہے اور انہیں ریختے کا استاد تسلیم کیا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ وہ ان کے بنائے ہوئے راستے پر پوری طرح چل نہیں سکے ہیں کیونکہ ان کے مخصوص مزاج نے اپنے لئے نئے راستے بنا لئے ہیں۔

اس فنی اور لسانی پس منظر کو سامنے رکھے بغیر غالب کی زبان کا صحیح تجزیہ نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ شاعری کی زبان میں یہ میلانات اور رجحانات دراصل وہ سرچشمے تھے جن سے غالب نے اپنی شاعری کی زبان کا ہیولا تیار کیا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے اثرات کسی نہ کسی زاویے سے ان کی استعمال کی ہوئی زبان میں اپنی جھلک ضرور دکھاتے ہیں۔

یہ اثرات اپنی اپنی جگہ اہم ضرور ہیں اور غالب نے ان کی اہمیت کو تسلیم بھی کیا ہے۔ لیکن فارسی زبان اور فارسی کی شعری روایت کے اثرات بھی اُن کی زبان میں بڑے گہرے اور ہمہ گیر ہیں۔ غالب کو فارسی زبان پر پورا عبور حاصل تھا۔ وہ فارسی کے بلند پایہ شاعر تھے۔ بلکہ اپنے آپ کو بنیادی طور پر فارسی ہی کا شاعر سمجھتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ ان کی شاعری کی روح اور اس کے نقش ہائے رنگ رنگ کو اگر دیکھنا ہو تو ان کی فارسی شاعری کا مطالعہ کرنا چاہیئے۔ ان کی اردو شاعری کا مجموعہ فارسی کے مقابلے میں بے رنگ ہے ہے

فارسی بیں تا بہ بینی نقش ہائے رنگ رنگ
بگذر از مجموعۂ اُردو کہ بے رنگ من است

غالب نے اس شعر کے پہلے مصرعے میں جس خیال کا اظہار کیا ہے اس سے تو اتفاق کیا جا سکتا ہے لیکن دوسرے حصّے میں جس خیال کا اظہار ہے اس سے اتفاق کرنا مشکل ہے ۔ ان کا اردو کا مجموعہ بے رنگ نہیں ہے ۔ اس میں تو نقش ہائے رنگ رنگ کا ایک جلوۂ صد رنگ ہے جو دلوں میں اپنی جگہ بناتا ہے اور حواس پر ایک سرخوشی بن کر چھا جاتا ہے ۔

غالب کے اُردو کلام میں جو رنگینی اور رچاؤ ہے اور جس نے اس کو نقش ہائے رنگ رنگ کا جلوۂ صد رنگ بنا دیا ہے ، وہ فارسی زبان کی رنگینی اور رچاؤ کا مرہونِ منّت ہے ۔ فارسی زبان کے اثر سے ان کی زبان میں شیرینی اور حلاوت ، رنگینی اور رعنائی کی کیفیت پیدا ہو گئی ہے ۔ انہوں نے فارسی کے الفاظ کو استعمال کرکے اور ان کی بے شمار ترکیبوں کو تراش کر اپنی زبان میں اس طرح کھپایا ہے کہ ان کی شاعری کی زبان میں گُل بوٹے سے کھلے ہوئے اور چمن زار سے مسکراتے ہوئے نظر آتے ہیں ۔

یہ اشعار دیکھئے ؎

دل تا جگر کہ ساحلِ دریائے خوں ہے اب
اس رہ گذر میں جلوۂ گُل آگے گرد تھا

احباب چارہ سازیِ وحشت نہ کر سکے
زنداں میں بھی خیال بیاباں نورد تھا

ہوائے سیرِ گُل آئینۂ بے مہریِ قاتل
کہ اندازِ بخوں غلطیدنِ بسمل پسند آیا

جراحت تحفہ، الماس ارمغاں داغ جگر ہدیہ
مبارک باد اسدؔ غمخوارِ جانِ دردمند آیا

ہوں ترے وعدہ نہ کرنے پہ بھی راضی کہ کبھی
گوش منّت کشِ گلبانگ تسلّی نہ ہوا

بیاں کیا کیجیے بیداد کاوش ہائے مژگاں کا
کہ ہر اک قطرۂ خوں دانہ ہے تسبیحِ مرجاں کا

رنگِ شکستہ صبحِ بہارِ نظارہ ہے
یہ وقت ہے شگفتنِ گل ہائے ناز کا

تاراج کاوشِ غمِ ہجراں ہوا اسدؔ
سینہ کہ تھا دفینہ گہر ہائے راز کا

جلوۂ گل نے کیا تھا واں چراغاں آب جو
یاں رواں مژگانِ چشمِ تر سے خونِ ناب تھا

ناگہاں اس رنگ سے خوں نابہ ٹپکانے لگا
دل کہ ذوقِ کاوشِ ناخن سے لذت یاب تھا

کچھ نہ کی اپنے جنونِ نارسا نے ورنہ یاں
ذرہ ذرہ روکشِ خورشیدِ عالمتاب تھا

اب میں ہوں اور ماتمِ یک شہرِ آرزو
توڑا جو تو نے آئینۂ تمثال دار تھا

گلیوں میں میری نعش کو کھینچے پھرو کہ میں
جاں دادۂ ہوائے سرِ رہگذار تھا

نوازش ہائے بے جا دیکھتا ہوں
شکایت ہائے رنگیں کا گلا کیا

دماغِ عطرِ پیراہن نہیں ہے
غمِ آوارگی ہائے صبا کیا

باغ شگفتہ تیرا بساطِ نشاطِ دل
ابرِ بہار خمکدہ کس کے دماغ کا

ذرہ ذرہ ساغرِ مے خانۂ نیرنگ ہے
گردشِ مجنوں بہ چشمک ہائے لیلیٰ آشنا

ربط یک شیرازۂ وحشت ہیں اجزائے بہار
سبزہ بیگانہ، صبا آوارہ، گُل نا آشنا

غافل بہ وہمِ ناز خود آرا ہے ورنہ یاں
بے شانۂ صبا نہیں طرّہ گیاہ کا

توٗ اور آرائشِ خمِ کاکل
میں اور اندیشہ ہائے دُور دراز

یک نظر بیش نہیں فرصتِ ہستی غافل
گرمیٔ بزم ہے اک رقصِ شرر ہونے تک

محفلیں برہم کرے ہے گنجفہ بازِ خیال
ہیں ورق گردانیٔ نیرنگِ یک بت خانہ ہم

فرصتِ کاروبارِ شوق کسے
ذوقِ نظارۂ جمال کہاں

رونقِ ہستی ہے عشقِ خانہ ویراں ساز سے
انجمن بے شمع ہے گر برقِ خرمن میں نہیں

یاد تھیں ہم کو بھی رنگا رنگ بزم آرائیاں
لیکن اب نقش و نگارِ طاقِ نسیاں ہو گئیں

گل فشانی ہائے نازِ جلوہ کو کیا ہو گیا
خاک پر ہوتی ہے تیری لالہ کاری ہائے ہائے

کس طرح کاٹے کوئی شب ہائے تارِ برشگال
ہے نظر خو کردۂ اختر شماری ہائے ہائے

وحشت گاہ دیدۂ خوں بارِ مجنوں دیکھنا
یک بیاباں جلوۂ گل فرشِ پا انداز ہے

غنچہ تا شگفتن ہا برگِ عافیت معلوم
باوجودِ دلجمعی خوابِ گل پریشاں ہے

دیکھو تو دلفریبیٔ اندازِ نقشِ پا
موجِ خرامِ یار بھی کیا گُل کتر گئی

پھر کچھ اک دل کو بیقراری ہے
سینہ جویائے زخمِ کاری ہے

پھر جگر کھودنے لگا ناخن
آمدِ فصلِ لالہ کاری ہے

وہی صد رنگ نالہ فرسائی
وہی صد گونہ اشک باری ہے

جنوں تہمت کشِ تسکیں نہ ہو گر شادمانی کی
نمک پاشِ خراشِ دل ہے لذّت زندگانی کی

ساقی بہ جلوہ دشمنِ ایمان و آگہی
مُطرب بہ نغمہ رہزنِ تمکین و ہوش ہے

یا شب کو دیکھتے تھے کہ ہر گوشۂ بساط
دامانِ باغبان و کفِ گل فروش ہے

لطفِ خرامِ ساقی و ذوقِ صدائے چنگ
یہ جنتِ نگاہ وہ فردوسِ گوش ہے

ان اشعار میں دل تا جگر کہ ساحلِ دریائے خون ہے اب، چارہ سازیٔ وحشت، زنداں میں بھی خیال بیاباں نورد تھا، ہوائے سیرِ گل، آئینۂ بے مہریٔ قاتل، کہ اندازِ بخوں غلطیدنِ بسمل، جراحت تحفہ، الماس ارمغان، داغِ جگر ہدیہ، منت کشِ گلبانگ تسلی، بیدادِ کاوش ہائے مژگاں، رنگِ شکستہ، صبحِ بہارِ نظارہ، شگفتنِ گل ہائے ناز، تاراجِ کاوشِ غمِ ہجراں، مژگانِ چشمِ تر، ذوقِ کاوشِ ناخن، روکشِ خورشیدِ عالم تاب، ماتمِ یک شہرِ آرزو، جان دادۂ ہوائے سرِ رہگذار، نوازش ہائے بے جا، شکایت ہائے رنگین، داغِ عطرِ پیراہن، غمِ آوارگی ہائے صبا، بساطِ نشاطِ دل، سلغرِ مے خانۂ نیرنگ، گردشِ مجنوں بہ چشمک ہائے لیلیٰ آشنا، ربطِ یک شیرازۂ وحشت، بے شانۂ صبا، آرائشِ خمِ کاکل، اندیشہ ہائے دور و دراز، گرمیٔ بزم، رقصِ شرر، ورق گردانیٔ نیرنگِ یک بت خانہ، فرصتِ کاروبارِ شوق، ذوقِ نظارۂ جمال، عشقِ خانہ ویران ساز، رنگا رنگ بزم آرائیاں، نقش و نگارِ طاقِ نسیاں، گل فشانی ہائے نازِ جلوہ، شب ہائے تارِ برشگال، خو کردۂ اختر شماری، دست گاہِ دیدۂ خوں بارِ مجنوں، یک بیابان جلوۂ گل، فرشِ پا اندازِ، غنچہ تا شگفتن ہا۔ دلفریبیٔ اندازِ نقشِ پا، موجِ خرامِ یار جویائے زخمِ کاری، صد رنگ نالہ فرسائی، آمدِ فصلِ لالہ کاری

صد گونہ اشک باری، جنوں تہمت کش تمکیں، نمک پاش خراش دل، دشمن ایمان و آگہی، رہزن تمکین و ہوش، دامان باغباں و کف گل فروش لطف خرام ساقی ذوق صدائے چنگ، جنت نگاہ اور فردوس گوش وغیرہ کی جو حسین اور دلآویز، رنگین اور پُرکار ترکیبیں غالب نے تراشی ہیں، وہ اُن کا ایک فنّی کارنامہ ہیں۔ اُردو شاعری میں ایسی دل کش اور جاذب نظر ترکیبیں کسی اور شاعر کے یہاں نہیں مل سکتیں۔ غالب ان ترکیبوں کو تراشنے میں صرف اس وجہ سے کامیاب ہوئے کہ وہ فارسی زبان پر پوری طرح قدرت رکھتے تھے اور اس کا رنگ و آہنگ غالب کی شخصیت کا جز بن گیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ غالب کی تراشی ہوئی ان ترکیبوں میں اُن کی کوئی شعوری کوشش اور کاوش نظر نہیں آتی۔ اسی لئے ان میں صناعی کے عمل کا احساس نہیں ہوتا۔ وہ تو اُن کے یہاں فطری انداز میں ایک تخلیقی عمل کے طور پر وجود اختیار کرتی ہیں اور ان کے تہہ در تہہ جذباتی تجربات اور رنگین اور پُرکار افکار و خیالات کا مکمل اظہار و ابلاغ ان ترکیبوں کے ذریعے سے ہوتا ہے۔

غالب نے فارسی کی ان بے شمار رنگین اور پُرکار ترکیبوں کو تراش کر نہ صرف اظہار و ابلاغ کا حق ادا کیا ہے بلکہ جمالیاتی اعتبار سے بھی اپنی شاعری کی زبان کو حد درجہ رنگین اور پُرکار بنا دیا ہے اور ساتھ ہی ان کی وجہ سے شاعری کی زبان میں نئے امکانات کے چراغ روشن ہوئے ہیں اور نئی وسعتوں کی شمعیں فروزاں ہوئی ہیں۔ اور یہ غالب کا بہت بڑا فنی کارنامہ ہے۔ اس

میں شبہ نہیں کہ غالب نے اس کا تجربہ کیا لیکن ان کے زمانے ہی میں اس تجربے نے ایک روایت کی حیثیت اختیار کر لی۔ اس روایت کی اہمیت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ یہ روایت اور اس روایت کے اثرات غالب کے بعد آنے والے اُردو کے تقریباً تمام اہم شاعروں کے یہاں اپنا جادو جگاتی ہوئی نظر آتی ہے۔

غالب کی شاعری میں زبان کا استعمال ہمیشہ موضوع کی مناسبت سے ہوا ہے۔ فارسی زبان کے اثرات اُن کی شاعری میں جو اتنے گہرے نظر آتے ہیں، اس کا سبب بھی یہی ہے کہ وہ اپنے موضوع اور زبان کے درمیان ایک مناسبت پیدا کرنا چاہتے تھے۔ فارسی اُن کے مزاج میں رچی ہوئی تھی۔ اس لئے جب بھی انھوں نے اردو زبان کی تنگ دامانی کا احساس ہوا تو وہ اس میں وسعت کو پیدا کرنے کے لئے فارسی کی طرف متوجہ ہوئے۔ اور جہاں تک غالب کی شاعری کے موضوعات کا تعلق ہے ان میں تنوع تھا، وسعت اور گہرائی تھی۔ وہ تمام انسانی زندگی سے تعلق رکھتے تھے۔ اس لئے ان کے مکمل اظہار و ابلاغ کے لئے فارسی کا سہارا لینا لازمی تھا کیونکہ اس سہارے کے بغیر خالص اردو ان موضوعات کے اظہار و ابلاغ کے قابل نہیں تھی۔ پھر ایک بات یہ بھی ہے کہ غالب فارسی زبان کے جمالیاتی رنگ اور اس کے صوتی آہنگ کے قائل تھے۔ انہیں اس بات کا احساس بھی شدید تھا کہ فارسی ایک عظیم تہذیبی روایت کی علمبردار ہے۔ اس لئے انھوں نے اپنے فن کا

جمالیاتی ڈھانچہ اِسی زبان پر اُستوار کیا اور اپنی کوششوں سے ایک نئی زبان کی شاندار عمارت تعمیر کردی۔

موضوع کی مناسبت سے زبان کو استعمال کرنے کے شعور ہی کا یہ اثر ہے کہ غالب کے یہاں زندگی کے پیچیدہ، اہم اور گہرے مضامین فارسی کے سہارے ہی شاعری اور فن کا حصّہ بنے ہیں۔ لیکن سیدھے سادے مضامین کو غالب نے فارسی کے اثر کے بغیر سیدھی سادی عام اردو میں بھی پیش کیا ہے اور اس طرح اس مناسبت کے باعث ان کے سیدھے سادے اشعار بھی جمالیاتی اعتبار سے خاصی اہمیت کے مالک معلوم ہوتے ہیں۔ صرف چند اشعار اس صورتِ حال کی وضاحت کے لئے کافی ہیں ؎

حالِ دِل نہیں معلوم لیکن اس قدر یعنی
ہم نے بارہا ڈھونڈا، تم نے بارہا پایا

دل میں پھر گریہ نے اک شور اُٹھایا غالب
آہ جو قطرہ نہ نکلا تھا سو طوفان نکلا

گو نہ سمجھوں اُس کی باتیں گو نہ پاؤں اُس کا بھید
پر یہ کیا کم ہے کہ مجھ سے وہ پری پیکر کھلا

منہ نہ کھلنے پر ہے وہ عالم کہ دیکھا ہی نہیں
زلف سے بڑھ کر نقاب اس شوخ کے منہ پر کھلا

تھی خبر گرم کہ غالب کے اڑیں گے پرزے
دیکھنے ہم بھی گئے تھے پہ تماشا نہ ہوا

ہے خبر گرم ان کے آنے کی
آج ہی گھر میں بوریا نہ ہوا

گھر ہمارا جو نہ روتے بھی تو ویراں ہوتا
بحر اگر بحر نہ ہوتا تو بیاباں ہوتا

ہوئی مدت کہ غالب مر گیا پر یاد آتا ہے
وہ ہر اک بات پر کہنا کہ یوں ہوتا تو کیا ہوتا

کوئی ویرانی سی ویرانی ہے!
دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا

ہم تھے مرنے کو کھڑے پاس نہ آیا نہ سہی
آخر اس شوخ کے ترکش میں کوئی تیر بھی تھا

لاگ ہو تو اُس کو ہم سمجھیں لگاؤ
جب نہ ہو کچھ بھی تو دھوکا کھائیں کیا

پوچھتے ہیں وہ کہ غالب کون ہے
کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا

آئے ہے بے کسیٔ عشق پہ رونا غالب
کس کے گھر جائے گا سیلابِ بلا میرے بعد

سر پھوڑنا وہ غالبِ شوریدہ حال کا
یاد آگیا مجھے تری دیوار دیکھ کر

مَر گیا پھوڑ کے سر غالبِ وحشی تو ہے
بیٹھنا اس کا وہ آکر تری دیوار کے پاس

فکرِ دنیا میں سر کھپاتا ہوں
میں کہاں اور یہ وبال کہاں

کہتے ہیں جیتے ہیں اُمید پہ لوگ
ہم کو جینے کی بھی اُمید نہیں

لو وہ بھی کہتے ہیں کہ یہ بے ننگ و نام ہے
یہ جانتا اگر تو لُٹاتا نہ گھر کو میں

یوں ہی گر روتا رہا غالب تو اے اہلِ جہاں
دیکھنا اِن بستیوں کو تم کہ ویران ہو گئیں

اُگ رہا ہے در و دیوار پہ سبزہ غالب
ہم بیاباں میں ہیں اور گھر میں بہار آئی ہے

کوئی امید بر نہیں آتی
کوئی صورت نظر نہیں آتی

آگے آتی تھی حالِ دل پہ ہنسی
اب کسی بات پر نہیں آتی

ہے کچھ ایسی ہی بات جو چُپ ہوں
ورنہ کیا بات کر نہیں آتی

میں بھی مُنہ میں زبان رکھتا ہوں
کاش پُوچھو کہ مُدّعا کیا ہے

ہم نے مانا کہ کچھ نہیں غالبؔ
مفت ہاتھ آئے تو بُرا کیا ہے

کب وہ سُنتا ہے کہانی میری
اور پھر وہ بھی زبانی میری

چال جیسے کڑی کمان کا تیر
دِل میں ایسے کے جا کرے کوئی

بات پر واں زبان کٹتی ہے
وہ کہیں اور سُنا کرے کوئی

ان اشعار میں جو زبان استعمال کی گئی ہے، اُس میں فارسی سے کہیں زیادہ اُردو محاورے کا استعمال ہے۔ غالب فارسی لہجے اور انداز میں بات کرنے کے عادی ہیں اور ان کی شاعری میں بلاشبہ اس لہجے اور انداز کا پلّہ بھاری ہے۔ لیکن خیال اور مواد کی نسبت سے جب بھی ضرورت پیش آتی ہے تو وہ خالص اردو اور اس کے ٹھیٹھ لہجے میں بھی بات کرتے ہیں۔ حیرت تو یہ دیکھ کر ہوتی ہے کہ غالب اس خالص اُردو زبان کے انداز اور اس کے ٹھیٹھ لہجے کو غزل کے مزاج کا جُز بنا دیتے ہیں اور اُن کی شاعری میں اس کے استعمال سے صنفِ غزل کے کارگہِ شیشہ گری

کو ٹھیس نہیں لگتی۔

اور اس کا بنیادی سبب یہی ہے کہ غالب اردو زبان، اس کے مخصوص انداز، محاورے اور لہجے کو اُن جذبات و احساسات کی ترجمانی کے لئے استعمال کرتے ہیں جو فارسی زبان کے مخصوص انداز اور لہجے سے پوری طرح ظاہر نہیں ہو سکتا۔ مثلاً مندرجہ بار اشعار میں شور اٹھایا، گو نہ سمجھوں اس کی باتیں گو نہ پاؤں اس کا بھید، پری پیکر کھلا، زلف سے بڑھ کر نقاب اس شوخ کے مُنہ پر کھلا، تھی خبر گرم، آج ہی گھر میں بوریا نہ ہوا، گھر ہمارا جو نہ روتے بھی تو ویران ہوتا، ہوئی مدت کہ غالب مر گیا پر یاد آتا ہے۔ دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا، ہم تھے مرنے کو کھڑے، لاگ ہو تو اس کو ہم سمجھیں لگاؤ، جب نہ ہو کچھ بھی تو دھوکا کھائیں کیا۔ کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا، سر کھپاتا ہوں، یہ جانتا اگر تو لٹاتا نہ گھر کو میں۔ یوں ہی گر روتا رہا غالب اُگ رہا ہے، در و دیوار پہ سبزہ غالب، ہے کچھ ایسی ہی بات جو چپ ہوں، مفت ہاتھ آئے تو بُرا کیا ہے۔ کب وہ سنتا ہے کہانی میری چال جیسے کڑی کمان کا تیر، بات پر واں زبان کٹتی ہے۔ وہ کہیں اور سنا کرے کوئی، وغیرہ کے فقروں، جملوں اور ترکیبوں میں اُردو زبان اور اس کے خاص انداز اور لہجے کے اثرات غالب نظر آتے ہیں۔ غالب نے اس کو اپنے موضوع کی مناسبت سے استعمال کیا ہے اور اس مناسبت نے ان لفظوں، فقروں اور ترکیبوں کو بھی غزل کے مزاج کا جزو بنا دیا ہے جو غزل کی روایت کے ساتھ

کوئی خاص مناسبت نہیں رکھتے۔

غالب اس اعتبار سے ایک منفرد فن کار ہیں اور ان کے اس فنی تجربے نے صنفِ غزل کے لئے نئے فنی امکانات کے دروازے کھولے ہیں۔

فارسی اور اُردو زبان کے اتصال بلکہ امتزاج نے غالب کے فن میں بعض ایسے پہلو پیدا کئے ہیں جو شاید اُردو کے کسی دوسرے شاعر کے یہاں نہیں ملتے۔ مثلاً اس امتزاج سے ان کی زبان میں وہ شیرینی اور حلاوت پیدا ہوئی ہے جو ایرانی اور ہندی تہذیبوں کے اِمتزاج کی نشانی ہے۔ غالب نے فارسی کی شیرینی کو ہندی کی گھلاوٹ کے ساتھ اس طرح ملایا ہے کہ ان کی زبان میں ایک گنگا جمنی رنگ پیدا ہو گیا ہے۔ ان کے ایسے اشعار میں وہ رنگینی اور رعنائی پیدا نہیں ہوتی جو فارسی زبان کے زیرِ اثر تخلیق ہونے اشعار میں ملتی ہے۔ فارسی زبان کے اثرات تو ان کے کلام کے اُس حصے میں زبان نظر آتے ہیں جن میں زندگی کے رنگین پہلوؤں کا بیان ہوتا ہے۔ جن کی بُنیاد رومانیت اور تخیلؔ پسندی ہے لیکن زبان کی فارسی اور ہندی روایتوں کا امتزاج ان کے ایسے اشعار میں نسبتاً زیادہ ملتا ہے جن میں اُنھوں نے قلبی واردات کو پیش کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ گداز کی کیفیت ان میں زیادہ نمایاں ہے اور اسی اثر سے ان کے کلام کے ایک حصے میں وہ حلاوت اور گھلاوٹ پیدا ہو گئی ہے جو غنائی شاعری کا طرۂ امتیاز ہے۔ یہ چند اشعار اس میلان کے بہترین

ترجمان ہیں ؎

دل میں ذوقِ وصل و یادِ یار تک باقی نہیں
آگ اِس گھر کو لگی ایسی کہ جو تھا جل گیا

تھا زندگی میں مرگ کا کھٹکا لگا ہوا
اُڑنے سے پیشتر بھی مرا رنگ زرد تھا

میں نے روکا رات غالب کو وگرنہ دیکھتے
اس کے سیلِ گریہ میں گردوں کفِ سیلاب تھا

ہوئے مَر کے ہم جو رُسوا ہوئے کیوں نہ غرقِ دریا
نہ کبھی جنازہ اُٹھتا نہ کہیں مزار ہوتا

ہے ایک تیر جس میں دونوں چھدے پڑے ہیں
وہ دن گئے کہ اپنا دِل سے جگر جدا تھا

ہوئی مدّت کہ غالب مَر گیا پر یاد آتا ہے
وہ ہر اک بات پر کہنا کہ یوں ہوتا تو کیا ہوتا

رات دن گردش میں ہیں سات آسمان
ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا

آئے ہے بے کسیٔ عشق پہ رونا غالب
کس کے گھر جائے گا سیلابِ بلا میرے بعد

آہ کو چاہیئے اک عمر اثر ہونے تک
کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک

بنا کر فقیروں کا ہم بھیس غالب
تماشائے اہلِ کرم دیکھتے ہیں!

دائم پڑا ہوا ترے در پر نہیں ہوں میں
خاک ایسی زندگی پہ کہ پتھر نہیں ہوں میں

رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہو گئیں

اُس شمع کی طرح سے جس کو کوئی بجھا دے
میں بھی جلے ہوؤں میں ہوں داغِ ناتمامی

آگے آتی تھی حالِ دل پہ ہنسی
اب کسی بات پر نہیں آتی

پھر اُسی بے وفا پہ مرتے ہیں
پھر وہی زندگی ہماری ہے

آہی جاتا وہ راہ پر غالب
کوئی دن اور بھی جیئے ہوتے

کیا بیاں کر کے مرا روئیں گے یار
مگر آشفتہ بیانی میری

چاہنے کو تیرے کیا سمجھا تھا دل
بارے اب اس سے بھی سمجھا چاہیئے

میں بلاتا تو ہوں اس کو مگر اے جذبۂ دل
اس پہ بن جائے کچھ ایسی کہ بن آئے نہ بنے

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے
بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

ان اشعار کی سب سے نمایاں خصوصیت ان کی غنائیت ہے۔ ان کی بنیاد سوز و گداز ہے۔ اس سوز و گداز نے ان اشعار میں حلاوت اور گھلاوٹ کو پیدا کر دیا ہے۔ غالب نے ان اشعار

میں جو زبان استعمال کی ہے، اس میں فارسی کے اثر کے ساتھ اُردو زبان کے اثرات بھی نمایاں ہیں۔ اور حقیقت یہ ہے کہ ان دونوں کے حسین اور متوازن امتزاج ہی نے سوز و گداز کی اس کیفیت میں شدت پیدا کرکے ان کو حلاوت اور گھلاوٹ سے ہمکنار کیا ہے۔

فارسی اور اُردو زبان کی روایتوں کا یہ امتزاج بھی غالب کا ایک فنی کارنامہ ہے اور اس نے ان کے فن میں حواس کو متاثر کرنے کی صلاحیت بدرجۂ اتم پیدا کر دی ہے۔

غالب کے فن میں جو زبان استعمال ہوئی ہے اس میں الفاظ کا صوتی آہنگ بھی بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ انہوں نے الفاظ کے مخصوص دروبست سے جگہ جگہ اپنے فن میں وہ موسیقیت اور نغمگی پیدا کر دی ہے۔ جو پڑھنے اور سننے والوں دونوں کے حواس پر براہِ راست اثر کرتی ہے۔ غالب کے یہاں مختلف الفاظ کو مِلا کر ایک مترنم کیفیت کو پیدا کرنے کا بڑا سلیقہ ہے۔ یوں تو وہ منفرد الفاظ کی نغمگی اور موسیقیت کا بھی گہرا شعور رکھتے ہیں اور انہوں نے تجربات کے اظہار کے لئے موضوع کی مناسبت سے ان الفاظ کے انتخاب میں بھی بڑے فن کارانہ شعور کا اظہار کیا ہے لیکن

مختلف الفاظ کی مخصوص دروبست سے جو نغمگی اور موسیقیت پیدا ہو سکتی ہے، اس میں غالب اپنا جواب نہیں رکھتے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے بیشتر اشعار میں مرکّب الفاظ کے مخصوص استعمال کی وجہ سے پیدا ہونے والی موسیقیت اور نغمگی کا کمال نظر آتا ہے۔ یہ چند اشعار دیکھئے ؎

دِل میں ذوقِ وصل و یادِ یار تک باقی نہیں
آگ اِس گھر کو لگی ایسی کہ جو تھا جل گیا

دِل تا جگر کہ ساحلِ دریائے خوں ہے اب
اس رہگذر میں جلوہ گُل آگے گرد تھا

احباب چارہ سازیٔ وحشت نہ کر سکے
زندان میں بھی خیال بیاباں نورد تھا

ہوائے سیرِ گُل آئینہ بے مہریٔ قاتل
کہ اندازِ بخوں غلطیدنِ بسمل پسند آیا

خموشی میں نہاں خوں گشتہ لاکھوں آرزوئیں ہیں
چراغِ مُردہ ہوں میں بے زبان گورِ غریباں کا

نہیں معلوم کس کس کا لہو پانی ہوا ہوگا
قیامت ہے سرشک آلودہ ہونا تیری مژگاں کا

رنگِ شکستہ صبحِ بہارِ نظارہ ہے
یہ وقت ہے شگفتنِ گل ہائے ناز کا

ہیں بس کہ جوشِ بادہ سے شیشے اُچھل رہے
ہر گوشۂ بساط ہے سر شیشہ باز کا

تاراجِ کاوشِ غمِ ہجراں ہوا اسد
سینہ کہ تھا دفینہ گہر ہائے راز کا

گرچہ ہوں دیوانہ پر کیوں دوست کا کھاؤں فریب
آستیں میں دشنہ پنہاں ہاتھ میں خنجر کھلا

واں کرم کو عذرِ بارش تھا عناں گیرِ خرام
گریہ سے یاں پنبۂ بالش کفِ سیلاب تھا

جلوۂ گل نے کیا تھا واں چراغاں آب جو
یاں رواں مژگانِ چشمِ تر سے خونِ ناب تھا

ناگہاں اِس رنگ سے خونِ نابہ ٹپکانے لگا
دل کہ ذوقِ کاوشِ ناخن سے لذّت یاب تھا

خانہ زادِ زلف ہیں زنجیر سے بھاگیں گے کیوں
ہیں گرفتارِ وفا زنداں سے گھبرائیں گے کیا

نوازش ہائے بے جا دیکھتا ہوں
شکایت ہائے رنگیں کا گلا کیا

اسدؔ ہم وہ جنوں جولاں گدائے بے سر و پا ہیں
کہ ہے سر پنجۂ مژگانِ آہو پشت خار اپنا

باغ میں مجھ کو نہ لے ورنہ میرے حال پر
ہر گلِ تر ایک چشمِ خوں فشاں ہو جائے گا

صید میں ہے ترے وحشی کو وہی زُلف کی یاد
ہاں کچھ اک رنجِ گراں باریٔ زنجیر بھی تھا

جاتا ہوں داغِ حسرتِ ہستی لیے ہوئے
ہوں شمعِ کُشتہ درخورِ محفل نہیں رہا

ذرّہ ذرّہ ساغرِ مے خانۂ نیرنگ ہے
گردشِ مجنوں بہ چشمک ہائے لیلےٰ آشنا

دردِ دل لکھوں کب تک جاؤں اُن کو دکھلاؤں
انگلیاں فگار اپنی خامہ خونچکاں اپنا

ہم کہاں کے دانا تھے کس ہنر میں یکتا تھے
بے سبب ہوا غالب دشمن آسماں اپنا

بخشے ہے جلوۂ گُل ذوقِ تماشا غالب
چشم کو چاہیئے ہر رنگ میں وا ہو جانا

چھپکے چھپکے مجھ کو روتے دیکھ پاتا ہے اگر
ہنس کے کرتا ہے بیانِ شوخیِ گفتارِ دوست

شمع بجھتی ہے تو اس میں سے دھواں اٹھتا ہے
شعلۂ عشق سیہ پوش ہوا میرے بعد

خوں ہے دل خاک میں احوالِ بتاں پر یعنی
ان کے ناخن ہوئے محتاجِ حنا میرے بعد

نشاطِ داغِ غمِ عشق کی بہار نہ پوچھ
شگفتگی ہے شہیدِ گُلِ خزانیٔ شمع

غم نہیں ہوتا ہے آزادوں کو بیش از یک نفس
برق سے کرتے ہیں روشن شمعِ ماتم خانہ ہم

آبرو کیا خاک اس گُل کی جو گلشن میں نہیں
ہے گریباں ننگِ پیراہن جو دامن میں نہیں

رونقِ ہستی ہے عشقِ خانہ ویراں ساز سے
انجمن بے شمع ہے گر برق خرمن میں نہیں

غالب چھٹی شراب پر اب بھی کبھی کبھی
پیتا ہوں روزِ ابر و شبِ ماہتاب میں

اصلِ شہود و شاہد و مشہود ایک ہے
حیراں ہوں پھر مشاہدہ ہے کس حساب میں

جوئے خوں آنکھوں سے بہنے دو کہ ہے شامِ فراق
میں یہ سمجھوں گا کہ شمعیں دو فروزاں ہو گئیں

پُرسشِ طرزِ دلبری کیجیے کیا کہ بن کہے
اُس کے ہر اک اشارے سے نکلے ہے یہ ادا کہ یوں

نہ کرتا کاش نالہ مجھ کو کیا معلوم تھا ہمدم
کہ ہوگا باعثِ افزائشِ دردِ دروں وہ بھی

مئے عشرت کی خواہش ساقیٔ گردوں سے کیا کیجیے
لیے بیٹھا ہے اک دو چار جامِ واژگوں وہ بھی

مرے دل میں ہے غالبؔ شوقِ وصل و شکوۂ ہجراں
خدا وہ دن کرے جو اُس سے میں یہ بھی کہوں وہ بھی

چشمِ خوباں خامشی میں بھی نوا پرداز ہے
سُرمہ تو کہوے کہ دودِ شعلۂ آواز ہے

عشق مجھ کو نہیں وحشت ہی سہی
میری وحشت، تری شُہرت ہی سہی

سختیٔ کشانِ عشق کی پُوچھے ہے کیا خبر
وہ لوگ رفتہ رفتہ سراپا الم ہُوئے

یا شب کو دیکھتے تھے کہ ہر گوشۂ بساط
دامانِ باغبان و کفِ گل فروش ہے

لطفِ خرامِ ساقی و ذوقِ صدائے چنگ
یہ جنّتِ نگاہ وہ فردوسِ گوش ہے

ان اشعار ہیں دل ہیں ذوقِ وصل و یادِ یار، دل تا جگر کہ ساحلِ دریا تے خون، چارہ سازیٔ وحشت، زنداں میں بھی خیال بیاباں نورد تھا۔ آئینۂ بے مہریٔ قاتل، اندازِ بخوں غلطیدنِ بسمل، خموشی میں نہاں خون گشتہ، سرِ شک آلودہ ہونا تیری مژگاں کا، رنگ شکستہ، شگفتن گل ہائے ناز، جوشِ بادہ سے شیشے اُچھل رہے، ہر گوشۂ بساط ہے سر شیشہ باز کا، تاراجِ کاوشِ غمِ ہجراں، سینہ کہ تھا دفینہ، آستین میں دشنہ پنہاں، ہاتھ میں خنجر کھلا، عناں گیرِ خرام، پنبۂ بالش یاں رواں مژگان چشم ترسے خون ناب تھا۔ ذوقِ کاوشِ ناخن، زنداں سے گھبرائیں گے کیا، نوازش ہائے بے جا، شکایت ہائے رنگین، جنون جولاں گدائے، سرِ پنجۂ مژگانِ آہو، ہر گلِ تر ایک چشم خون فشاں، رنجِ گرانباریٔ زنجیر، داغِ حسرت ہستی، شمعِ کشتہ، درخورِ محفل، ساغرِ مے خانۂ نیرنگ، گردشِ مجنوں بہ چشمک ہائے لیلیٰ آشنا، انگلیاں فگار اپنی خامہ خونِ چکاں اپنا، ہم کہاں کے دانا تھے کس ہنر میں یکتا تھے، جلوۂ گل، ذوقِ تماشا، چشم کو چاہیے، شوخیٔ گفتارِ دوست، شعلۂ عشق سیہ پوش ہوا، ان کے

ناخن ہوئے محتاجِ حنا، نشاط داغ غمِ عشق، شہد گل خزائی شمع بینش از یک نفس، شمع ماتم خانۂ ہم، ہے گریباں ننگ پیراہن جو دامن میں نہیں، روزِ ابرو شب ماہتاب، شہود و شاہد و مشہود شمعیں دو فروزاں ہوگئیں، پرسشِ طرزِ دلبری، باعث افزائش دردِ دروں، مئے عشرت کی خواہش، اک دو چار جام واژگوں، شوقِ وصل و شکوۂ ہجراں، دودِ شعلۂ آواز، میری وحشت تری شہرت ہی سہی، سختی کشانِ عشق ہر گوشۂ بساط، دامانِ باغباں و کفِ گل فروش، لطفِ خرامِ ساقی و ذوقِ صدائے چنگ وغیرہ کی ترکیبوں سے نغمگی اور موسیقیت کے چشمے سے پھوٹتے ہوئے نظر آتے ہیں اور جو صوتی آہنگ اُن کی مناسب اور تناسب دروبست سے پیدا ہوتا ہے وہ فردوسِ گوش کی حیثیت رکھتا ہے اور اس کو صرف محسوس ہی کیا جا سکتا ہے۔

غالب نے شاعری کی زبان میں بڑی وسعتیں پیدا کی ہیں۔ ان کی زبان محدود نہیں ہے۔ وہ صحیح معنوں میں شاعری کی زبان ہے۔ اور شاعری کی زبان ہونے ہی کا یہ اثر ہے کہ اس میں زندگی کی سی وُسعت اور کشادگی نظر آتی ہے۔ اُن کے یہاں زبان الفاظ کے متحرک اور زندہ مجموعے کا نام ہے۔ ان الفاظ میں اُن کے خیال کا لہو ہے۔ اُن کے فکر کی گرمی ہے۔ اُن کے جذبے کی روشنی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ زندگی سے بھرپور نظر آتے ہیں اور اُن میں بڑی ہی جولانی کا احساس ہوتا ہے۔ غالب کے استعمال کیے ہوئے الفاظ صرف الفاظ نہیں ہیں۔ ان کی حیثیت علامتوں کی

ہے، اشاروں کی ہے، تشبیہوں کی ہے، استعاروں کی ہے۔ وہ سیدھے سادے اور سپاٹ نہیں ہیں۔ ان میں تو پہلودار کیفیت ہے۔ ان کی معنویت تو بہت پھیلی ہوئی ہے۔ وہ تو رمز و ایما کے پردے میں نہ جانے کیا کیا کچھ کہتے ہیں۔ پھر سب سے بڑی بات یہ ہے کہ یہ الفاظ ہیرے کی طرح ترشے ہوئے ہیں۔ ان کو آپس میں مِلا کر اور ایک دوسرے کے ساتھ پوری طرح ہم آہنگ کر کے اُنہوں نے مجموعی طور پر زبان کے ایک نئے رنگ و آہنگ کی تخلیق کی ہے اور اس طرح انہوں نے شاعری کی زبان کو ایک نئی زندگی سے ہمکنار کیا ہے۔ اور اس کو نئے آسمانوں پر پرواز کرنا سکھایا ہے۔

یہ زبان، اِس میں شبہ نہیں کہ ادبی زبان ہے اور غالب کا فنی کارنامہ اسی ادبی زبان کی تخلیق ہے۔ اُنہوں نے اپنی شاعری میں جو زبان استعمال کی ہے وہ عام لوگوں کی زبان نہیں ہے۔ اس میں تو ایک ادبی لب و لہجہ ہے۔ وہ تو ایک تہذیب کی زبان ہے۔ ایک جمالیاتی نظام کی زبان ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس میں بڑا رچاؤ نظر آتا ہے۔ بڑی ہی رنگینی اور رعنائی کا احساس ہوتا ہے اور بڑی ہی پُرکاری دکھائی دیتی ہے۔ مُرصّع کاری بھی اس کی اہم خصوصیت ہے۔ وہ سجی سجائی ہے اور اس میں تہذیب و آرائش کا خاص اہتمام کیا گیا ہے۔ اس میں بانکپن اور طرح داری ہے اور اس کو دیکھ کر یہ احساس ہوتا ہے کہ اس کو بنانے اور سنوارنے کی خاص طور پر کوشش کی گئی ہے اور اس سلسلے میں خاص محنت

سے کام لیا گیا ہے۔ لیکن یہ کوشش اور محنت ایک شاعر اور فن کار کی کوشش اور محنت ہے۔ اس لئے اس میں تصنع کا شائبہ تک نہیں ہوتا۔ بلکہ شروع سے آخر تک ایک فطری رنگ و آہنگ نظر آتا ہے۔

غالب کی زبان میں اُن کا لہجہ بھی خاصے کی چیز ہے۔ اس لہجے کے استعمال کی وجہ سے ان کی زبان میں نہ صرف پہلودار کیفیت بلکہ اکثر جگہ ایک ڈرامائی شان بھی پیدا ہو گئی ہے۔ اس ڈرامائی شان نے اُن کی زبان کو زندگی سے قریب کیا ہے اور اس میں اصلیت اور واقعیت کی لہر دوڑا دی ہے۔ یہ اشعار زندگی سے کتنے بھرپور، اصلیت و واقعیت سے کس قدر لبریز اور آہنگ کے لحاظ سے کس قدر متحرک ہیں ؎

کہتے ہو نہ دیں گے ہم دِل اگر پڑا پایا
دل کہاں کہ گم کیجے ہم نے مُدعا پایا

جاتی ہے کوئی کش مکش اندوہِ عشق کی
دِل بھی اگر گیا تو وہی دِل کا درد تھا

کس سے محرومیٔ قسمت کی شکایت کیجیے
ہم نے چاہا تھا کہ مرجائیں سو وہ بھی نہ ہوا

نہیں معلوم کس کس کا لہو پانی ہُوا ہوگا
قیامت ہے سرشک آلودہ ہونا تیری مژگاں کا

کی مرے قتل کے بعد اُس نے جفا سے توبہ
ہائے اُس زودِ پشیماں کا پشیماں ہونا

حیف اُس چار گرہ کپڑے کی قسمت غالب
جس کی قسمت میں ہو عاشق کا گریباں ہونا

پُوچھ مت رسوائی اندازِ استغنائے حسن
دست مرہونِ حنا رُخسار رہنِ غازہ تھا

بے نیازی حد سے گُذری بندہ پرور کب تلک
ہم کہیں گے حالِ دل اور آپ فرمائیں گے کیا

حضرتِ ناصح گر آئیں دیدہ و دل فرشِ راہ
کوئی مجھ کو یہ تو سمجھا دو کہ سمجھائیں گے کیا

گر کیا ناصح نے ہم کو قید اچھا یوں سہی
یہ جنونِ عشق کے انداز چھُٹ جائیں گے کیا

ہے اب اس معمورہ میں قحطِ غمِ اُلفت اسدؔ
ہم نے یہ مانا کہ دلّی میں رہیں کھائیں گے کیا

سُن اے غارت گرِ جنسِ وفا سُن
شکستِ شیشۂ دِل کی صدا کیا

نہ دے نامے کو اِتنا طول غالبؔ مختصر لکھ دے
کہ حسرت سنج ہوں عرضِ ستم ہائے جُدائی کا

فائدہ کیا؟ سوچ آخر، تو بھی دانا ہے اسدؔ
دوستیٔ ناداں کی ہے جی کا زیاں ہو جائے گا

میں اور بزمِ مے سے یوں تشنہ کام آؤں
گر میں نے کی تھی توبہ ساقی کو کیا ہُوا تھا

ہوئی مدّت کہ غالبؔ مَر گیا پر یاد آتا ہے
وہ ہر اک بات پر کہنا کہ یوں ہوتا تو کیا ہوتا

آئینہ دیکھ اپنا سا منہ لے کے رہ گئے
صاحب کو دِل نہ دینے پہ کتنا غرور تھا

پوچھتے ہیں وہ کہ غالب کون ہے
کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا

نہ لڑ ناصح سے غالب کیا ہوا گر اس نے شدت کی
ہمارا بھی تو آخر زور چلتا ہے گریباں پر

مر گیا پھوڑ کے سر غالبِ وحشی ہے ہے
بیٹھنا اس کا وہ آ کر تری دیوار کے پاس

تماشا کر اے محوِ آئینہ داری
تجھے کس تمنا سے ہم دیکھتے ہیں

خواہش کو احمقوں نے پرستش دیا قرار
کیا پوچھتا ہوں اس بتِ بیداد گر کو میں

لو وہ بھی کہتے ہیں کہ میں بے ننگ و نام ہوں
یہ جانتا تو آگ لگاتا نہ گھر کو میں

کرتے کس منہ سے ہو غربت کی شکایت غالب
تم کو بے مہریِ یارانِ وطن یاد نہیں

تم اُن کے دعوے کا ذکر اُن سے کیوں کرو غالب
یہ کیا؟ کہ تم کہو اور وہ کہیں کہ یاد نہیں

دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت درد سے بھر نہ آئے کیوں
روئیں گے ہم ہزار بار کوئی ہمیں ستائے کیوں

وفا کیسی؟ کہاں کا عشق؟ جب سر پھوڑنا ٹھہرا
تو پھر اے سنگدل تیرا ہی سنگِ آستاں کیوں ہو

میرے ہونے میں ہے کیا رُسوائی
اے وہ مجلس نہیں خلوت ہی سہی

جلوہ زارِ آتشِ دوزخ ہمارا دِل سہی
فتنۂ شورِ قیامت کس کی آب و گِل میں ہے

ہے دلِ شوریدۂ غالب طلسمِ پیچ و تاب
رحم کر اپنی تمنّا پر کہ کس مشکل میں ہے

مارا زمانے نے اسد اللہ خاں تمہیں
وہ ولولے کہاں وہ جوانی کدھر گئی

دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے
آخر اس درد کی دوا کیا ہے

ہر ایک بات پہ کہتے ہو تم کہ تو کیا ہے
تمہیں کہو کہ یہ اندازِ گفتگو کیا ہے

نہ شعلے میں یہ کرشمہ نہ برق میں یہ ادا
کوئی بتاؤ کہ وہ شوخ تند خو کیا ہے

کب وہ سنتا ہے کہانی میری
اور پھر وہ بھی زبانی میری

دکھا کے جنبشِ لب ہی تمام کر ہم کو
نہ دے جو بوسہ تو منہ سے کہیں جواب تو دے

پلا دے اوک سے ساقی جو ہم سے نفرت ہے
پیالہ گر نہیں دیتا نہ دے شراب تو دے

اسد خوشی سے مرے ہاتھ پاؤں پھول گئے
کہا جو اس نے ذرا میرے پاؤں داب تو دے

ہستی ہے نہ کچھ عدم ہے غالب
آخر تو کیا ہے ؟ اے "نہیں ہے"

ہاں نشاطِ آمدِ فصلِ بہاری واہ وا
پھر ہوا ہے تازہ سودائے غزل خوانی مجھے

ان اشعار میں لہجے کی ساحری ہے۔ الفاظ سیدھے سادے ہیں۔ زبان صاف ہے۔ لیکن الفاظ اور زبان کا استعمال لہجے کی کسی خاص کیفیت اور اس کے مخصوص صوتی آہنگ کو ظاہر کرتا ہے۔ ان اشعار میں سے ہر ایک میں موضوع کی مناسبت سے بات کرنے کا ایک خاص لہجہ ملتا ہے، اور اس لہجے سے ایک مخصوص صوتی آہنگ کی تخلیق ہوتی ہے اور مجموعی طور پر ایک محاکاتی انداز بعض تصویروں کو ابھارتا ہے۔ ان تصویروں میں ابھار اور گہرائی کی کیفیت ان تجربات کو زیادہ وضاحت کے ساتھ پیش کرتی ہے جو ان اشعار کی بنیاد ہیں۔ غالب نے اس لہجے کے استعمال سے دو کام لئے ہیں۔ ایک تو یہ کہ ان میں موضوع کا اظہار و ابلاغ پوری طرح ہوا ہے اور دوسرے مجموعی طور پر ایسی فضا بھی پیدا کی ہے۔ جو احساسِ جمال کی تسکین کا سامان فراہم کرتی ہے۔ غالب ان اشعار میں ایک چابکدست فن کار نظر آتے ہیں۔ کہیں انہوں نے اپنی چابک دستی کا اظہار اردو روزمرہ کے استعمال سے کیا ہے، کہیں مکالمے کا انداز پیدا کر کے ایک ڈرامائی شان پیدا کی ہے۔ کہیں صرف لہجے کے استعمال سے

ایک مانوس ماحول پیدا کر دیا ہے۔ کہیں بے ساختگی برجستگی اور بے باکی سے ایک خاص فضا پیدا کر دی ہے۔ غرض غالب نے الفاظ کے مخصوص استعمال سے ہر جگہ ایک مخصوص لہجے کی تخلیق کی ہے اور اس مخصوص لہجے کے استعمال سے ان کی شاعری میں کئی ایسے جمالیاتی پہلو پیدا ہو گئے ہیں جنھوں نے مجموعی طور پر ان کے فن کو بانکپن اور طرح داری سے ہمکنار کر دیا ہے۔

غالب زبان کے چابک دَست فن کار ہیں۔ اُنھوں نے زبان کے استعمال کو ایک فن بنا دیا ہے۔ اس میں وسعتیں پیدا کی ہیں۔ اس میں اس تہذیب کا رچاؤ پیدا کیا ہے جس کے سائے میں انھوں نے آنکھ کھولی اور پرورش پائی تھی، انھوں نے زبان کو خیال اور مواد کے ساتھ ہم آہنگ کیا ہے۔ اور موضوع کی مُناسبت سے زبان استعمال کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے یہاں زبان کے کئی روپ نظر آتے ہیں۔ کہیں تخیّل کی رنگین کاریاں ان کی زبان کو رنگین بَناتی ہیں۔ کہیں احساس کی شِدّت اس میں گداز کی کیفیت کو پیدا کرتی ہے۔ کہیں وہ فارسی کے اثر سے ایسے گُل کترتے ہیں کہ آنکھوں کے سامنے چمن زار سے مُسکراتے ہیں کہیں اُردو محاورے اور روزمرہ کو اس طرح استعمال کرتے ہیں کہ اس کی سادگی دِل میں اُتر جاتی ہے۔ کہیں الفاظ کو علامتوں اور اشاروں کا روپ دے دیتے ہیں۔ کہیں رمزیت اور ایمائیت کو پیدا کرتے ہیں۔ کہیں الفاظ کو اس طرح ترتیب دیتے ہیں کہ ان سے نغمگی اور موسیقیت کے چشمے پھوٹنے لگتے ہیں۔ کہیں الفاظ سے ایسے خطوط بناتے اور ایسے رنگ بکھیرتے ہیں کہ بیان میں مُصوّری

کی شان پیدا ہو جاتی ہے اور اس طرح جو تصویریں تیار ہوتی ہیں ان میں ابھار اور گہرائی کی وجہ سے حواس کو متاثر کرنے کا ایک عجیب جادو ہوتا ہے۔ ان کی زبان نہایت شگفتہ اور شاداب ہے۔ اس میں تازگی نظر آتی ہے۔ اس کے زندہ اور متحرک ہونے کا احساس ہوتا ہے۔ وہ بہت سجی سجائی معلوم ہوتی ہے اور اس میں پرکاری اور رنگینی کے عناصر نمایاں نظر آتے ہیں۔ اس میں بڑا بانکپن ہے بڑی ہی طرح داری ہے۔ بڑی ہی رعنائی ہے۔ بڑی ہی جگمگاہٹ ہے بڑی ہی تابانی ہے۔ ان کے الفاظ ستاروں کی طرح جگمگاتے ہیں اور زبان چاندنی کی طرح مسکراتی ہے۔

اور یہ صورتِ حال صرف اس وجہ سے ہے کہ غالب نے اپنے الفاظ میں معنویت کی بجلیاں بھر دی ہیں اور ان میں سے ہر ایک کو گنجینۂ معنی کا طلسم بنا دیا ہے۔

گنجینۂ معنی کا طلسم اس کو سمجھئے
جو لفظ کہ غالب مرے اشعار میں آوے

ماحصل

غالب کے فن کی اِس تفصیل اور اس کے مختلف پہلوؤں کے تجزیے سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ وہ ایک اعلیٰ درجے کے خالقِ جمال اور ایک بہت بڑے فن کار تھے۔ اُنھوں نے فن کی اہمیت کو سمجھا تھا اور وہ اُس کے بنیادی اصولوں کا گہرا شعور رکھتے تھے۔ ان اصولوں کو برتنا ان کے پیشِ نظر تھا۔ چنانچہ انھوں نے ان بنیادی اصولوں کو عملی طور پر بڑے سلیقے سے برتا ہے۔ وہ فن کی روایت کے پرستار تھے لیکن اس روایت کو تجربے کے ساتھ ہم آہنگ کرنا بھی اُن کے پیشِ نظر تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے فن میں روایت اور تجربے کا ایک حسین اور متوازن امتزاج ملتا ہے وہ حُسن وجمال کے شیدائی تھے اور زندگی اور فن دونوں میں اس حُسن کی تلاش و جستجو اُن کے پیشِ نظر تھی۔ چنانچہ وہ اس حُسن و

جمال کی تلاش و جستجو میں سرگرداں رہے ہیں اور اُنھوں نے اس کی تخلیق کو بھی اپنا شعار بنایا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کے فن میں حُسن و جمال کی تخلیق مختلف طریقوں سے ہوتی ہے اور وہ اس میں مختلف زاویوں سے اپنے آپ کو رونما کرتا ہے۔ وہ ایک تہذیب کی پیداوار ہیں اور اس تہذیب کا جمال ان کے فن میں اپنی تمام رنگینیوں اور رعنائیوں کے ساتھ بے نقاب نظر آتا ہے۔

اس میں شبہ نہیں کہ غالب کے مِزاج میں بغاوت کے عناصر پوری طرح موجود تھے۔ اور طبیعت اور اُفتادِ طبع کے اعتبار سے وہ ایک انقلابی تھے۔ اس کی ایک بہت بڑی وجہ انکی رومانیت اور رومان پسندی بھی تھی۔ ہر رومانی مزاج فن کار اپنے ماضی سے مطمئن نہیں ہوتا۔ خیال سے مُطابقت پیدا کرنا بھی اس کے لئے مشکل ہوتا ہے۔ وہ تو مُستقبل میں حَسین دُنیائیں بساتا ہے اور اِن دُنیاؤں کو اپنے تخیّل کے رنگوں سے سجاتا ہے۔ وہ صرف سہانے خواب دیکھتا ہے اور انہیں خوابوں کے سہارے اس کی زندگی بسر ہوتی ہے۔ غالب نے بھی اپنی رومانیت پسندی کی وجہ سے یہی سب کچھ کیا ہے۔ وہ کسی چیز سے مطمئن نہیں ہوئے خوب سے خوب تر کی تلاش میں اُنھوں نے زندگی اور فن کے اَن گنت صحراؤں کی خاک چھانی ہے لیکن ان تمام باتوں کے باوجود اُنھوں نے ماضی اور حال سے اپنا رشتہ توڑا نہیں ہے۔ انھوں نے روایت سے بغاوت ضرور کی ہے لیکن وہ روایت کے بعض

پہلوؤں کی پرستش میں بھی پیش پیش رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ رومانیت اور رومان پسندی کے باوجود روایت کا رچاؤ اور اُس کی رنگینی ان کے فن میں اپنی تمام تابانیوں کے ساتھ جلوہ گر ہے۔ غالب کے فن کا یہ بڑا کمال ہے کہ اس میں روایت کے اثرات صحتمندی کے ساتھ اپنے آپ کو رونما کرتے ہیں۔

روایت کے اثرات میں جو چیز سب سے زیادہ اُن کے یہاں نمایاں نظر آتی ہے وہ فارسی شاعری کی روایت اور خاص طور پر اس روایت کے ان علمبرداروں کے اثرات ہیں جن کی شاعری نے خود اس روایت کو رنگین اور پرکار بنانے میں نمایاں حصّہ لیا ہے۔ بیدلؔ، عرفیؔ، نظیریؔ اور ظہوریؔ کے اثرات ان کے فن میں بہت نمایاں ہیں۔ ان شاعروں نے فارسی شاعری کی روایت کو جس رنگینی اور پرکاری سے آشنا کیا ہے، وہ مجموعی طور پر سمٹ کر غالب کے فن میں کچھ اس طرح سرایت کر گئی ہے جیسے کسی صحت مند اور توانا جسم میں تازہ اور رخشاں لہو دوڑتا ہے۔ غالب نے فارسی شاعری کی روایت سے رنگینی اور رچاؤ کی خصوصیات حاصل کی ہیں۔ اور انہیں اردو شاعری کی فنّی روایت کا جزو بنا دیا ہے۔ ان سے قبل اُردو شاعری میں معنوی اور صُوری دونوں اعتبار سے وہ شگفتگی اور شادابی نہیں تھی جو ان کے ہاتھوں پیدا ہوئی۔ غالب کے فن کا یہ بہت بڑا کارنامہ ہے کہ اس نے اردو شاعری کی روایت کو ان خصوصیات سے آشنا کیا۔

غالب کے فن میں ایک نشاطیہ رنگ اور طربیہ آہنگ

بھی خاصا نمایاں نظر آتا ہے۔ بظاہر تو یہ رنگ و آہنگ ان کی شخصیت اور افتادِ طبع کا ترجمان اور عکاس ہے لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ فارسی شاعری کی روایت کے اثرات بھی ان کے فن میں اس رنگ و آہنگ کو نمایاں کرنے میں برابر کے شریک ہیں۔ غالب سے قبل اس رنگ و آہنگ کی روایت اُردو شاعری میں موجود نہیں تھی۔ البتہ فارسی شاعری میں اس کا ایک سلسلہ ملتا ہے اور خاصی تعداد میں شاعر اس رجحان کے علم بردار نظر آتے ہیں۔ غالب کا فن اس رُجحان سے متاثر ہوا ہے۔ اور اس میں نشاط و طرب کی وہ جو ایک چاندنی سی مسکراتی ہوئی نظر آتی ہے اس کا سبب فارسی کی یہی روایت ہے جس کو غالب نے اپنے فن میں کچھ اس طرح داخل کیا ہے کہ اس نے اُردو شاعری کی دُنیا ہی بدل دی ہے۔

اس کا یہ مطلب نہیں کہ اُردو شاعری کی روایت سے غالب کا کوئی رشتہ نہیں ہے اور یہ کہ صرف فارسی شاعری کی روایت ہی ان پر اثر انداز ہوئی ہے۔ ایسا نہیں ہے۔ غالب نے اُردو شاعری کی روایت سے بھی اثر قبول کیا ہے اور یہ اثرات بھی ان کے فن میں نت نئے روپ اختیار کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ سب سے اہم بات جو اس سلسلے میں نظر آتی ہے وہ یہ ہے کہ اُنھوں نے فارسی اور اردو کی روایات کے باہمی امتزاج سے ایک تیسری روایت کو پیدا کیا ہے جو ان کا ایک اہم فنی کارنامہ ہے۔ اس اِمتزاج نے اُن کے فن میں نشاطیہ اور المیہ رنگ کی

دھوپ چھاؤں کو جنم دیا ہے۔ غالب نے ان دونوں کو اس طرح ہم آہنگ کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے کہ اُن کے فن میں شعلہ و شبنم ایک دوسرے سے گلے ملتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

غالب کے فن میں روایت کے اثر سے شوخی کا پہلو بھی نمایاں ہوا ہے۔ یہ شوخی ظاہر ہے کہ صنف غزل کے مزاج کے ساتھ مُناسبت نہیں رکھتی۔ لیکن غالب کا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے اس شوخی کو، اور اس شوخی کے اثر سے پیدا ہونے والے ایک مزاحیہ اور طنزیہ انداز کو غزل کے مزاج میں داخل کرنے کی کوشش کی ہے، اور اس کو غزل کے مزاج کا جُز بنا دیا ہے۔ اس شوخی اور طنز و مزاح کے عناصر غزل کی روایت میں شیخ، واعظ اور زاہد کے بیان میں تو ملتے تھے لیکن حُسن وعشق اور عاشق و معشوق کے معاملات کے بیان میں یہ رنگ ذرا مشکل ہی سے نظر آتا تھا۔ غالب پہلے شاعر ہیں جنہوں نے ان معاملات کے بیان میں بھی اس رنگ کو پیدا کر دکھایا۔ وہ اس طرح کہ غزل کی روایت میں عاشق اور معشوق کے معاملات سے متعلق ایسے مضامین جو فرسودہ ہو چکے تھے اور مضحکہ خیز معلوم ہوتے تھے، غالب نے ان کو اپنی غزل میں جگہ تو دی لیکن اس طرح جیسے وہ ان کا خاکہ اڑا رہے ہیں اور ان پر طنز کے بھر پور وار کر رہے ہیں۔ غالب کے اس انداز سے جو شاعری پیدا ہوئی ہے وہ بذات خود بھی اہم ہے۔ کیونکہ اس میں بڑی شگفتگی کا احساس ہوتا ہے لیکن اس سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ اِس انداز سے غزل کی روایت کو ایک نیا میدان

ملا ہے اور اس میدان میں اس کو ایک اہم صنف سخن کی حیثیت سے اپنے جوہر دکھانے کے مواقع نصیب ہوئے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ غالب کے بعد آنے والے غزل کے فن کار غالب کے اس اندازِ فن کو پوری طرح برتنے میں کامیاب نہیں ہو سکے ہیں لیکن غالب نے انہیں وہ راستے ضرور دکھا دیئے ہیں جن پر چل کر غزل کی صنف اپنے آپ کو فنی اعتبار سے نئی وسعتوں سے ہم کنار کر سکتی ہے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ غالب نے روایت سے بہت استفادہ کیا ہے۔ اور اس کے اثر سے اپنے فن میں نہ صرف رنگینی اور رچاؤ کی خصوصیات پیدا کی ہیں بلکہ بعض ایسے پہلو بھی اس میں نمایاں ہو گئے ہیں جن کی وجہ سے نہ صرف غالب کے فن میں بلکہ خود صنفِ غزل کے فن میں ایک نئے رنگ و آہنگ نے اپنی جگہ بنا لی ہے۔ لیکن غالب اس روایت کے پرستار نہیں ہیں۔ انھوں نے اپنے فن کو اس روایت کی لکیر کا فقیر نہیں بنایا ہے۔ وہ تو اس روایت کے بندھنوں کو توڑ کر اس کے حدود سے باہر بھی نکلے ہیں اور انھوں نے اپنے فن کو بعض نئے تجربات سے بھی آشنا کیا ہے۔ ان تجربات کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اُن میں توازن ہے اور اُن کی جڑیں روایت کی زمین میں پوری طرح پیوست ہیں۔ تجربہ جب روایت کے ساتھ پوری طرح ہم آہنگ ہوتا ہے اسی وقت فن کی دنیا میں اُسے حیات جاوداں ملتی ہے۔ غالب نے اپنے تجربے کو روایت کے ساتھ پوری طرح ہم آہنگ کیا ہے۔ اسی

لئے ان کے فن میں اس کی ایک مستقل حیثیت نظر آتی ہے۔

بات یہ ہے کہ غالب نے اپنے فن میں تجربے کے یہ چراغ صرف تجربے ہی کی خاطر روشن نہیں کئے۔ ان کے پیچھے تو ان کے نئے احساسات اور نئے شعور کا ہاتھ ہے اور ان نئے احساسات و شعور کی وجہ سے ان کے یہاں وہ نئے موضوعات و مضامین پیدا ہوئے ہیں جن کے اظہار و ابلاغ کے لئے انھیں ان تجربات سے کام لینا پڑا ہے۔ یہی سبب ہے کہ ان کے تجربات میں اختراع کا رنگ نظر نہیں آتا اور صرف صناعی کی صورت دکھائی نہیں دیتی۔ وہ اپنی ایک بنیاد رکھتے ہیں اور صاف معلوم ہوتا ہے کہ ان کو شاعر کے خیال، مواد اور موضوع اور اس کے صحیح جمالیاتی اظہار کے شعور نے پیدا کیا ہے۔ غالب نے بدلتے ہوئے حالات، نئے افکار و خیالات اور نئے جمالیاتی تصورات سے ان تجربات کا خمیر اٹھایا ہے۔ اسی لئے اُن میں ایک استواری نظر آتی ہے اور ایک موانست کا احساس ہوتا ہے۔

غالب کے ان تجربات کی جھلک سب سے پہلے تو انکی شاعری کے وزن و آہنگ میں دکھائی دیتی ہے۔ غالب نے اپنے موضوعات کی مُناسبت سے وزن و آہنگ کو استعمال کیا اور ان میں ایک مکمل ہم آہنگی پیدا کی۔ ان کی شاعری میں بحروں کا انتخاب، بعض خاص زمینوں کا استعمال، الفاظ کی مخصوص در و بست، ترکیبوں کی تراش ان سب میں ان کا تجرباتی مزاج اپنی جھلک دکھاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ غالب نے یہ سب کچھ اپنے موضوع کے اظہار و ابلاغ

کے لیے کیا ہے۔ غالب نے اپنے وزن و آہنگ میں جو شگفتگی اور شادابی اور بلند آہنگی پیدا کی ہے اور اپنی شاعری کو جس نغمگی اور موسیقیت سے روشناس کیا ہے، اُس کی مثال اردو شاعری میں اُن سے قبل نہیں ملتی۔ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے ان کے فن میں ترنم کے چشمے سے پھوٹ رہے ہیں اور نغموں کے دریا سے موجزن ہیں غالب کا کمال یہ ہے کہ وہ اپنی شاعری میں اس صورتِ حال کو پیدا کر کے اس تجربے کے صوتی آہنگ کو سامنے لا کر کھڑا کر دیتے ہیں۔ جس کی گہرائی کا کوئی ٹھکانا نہیں۔ اور جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان کے موضوع کی مکمل تصویر مع ایک وسیع پس منظر کے آنکھوں کے سامنے آ کر کھڑی ہو جاتی ہے۔

وزن و آہنگ کے اس نئے تجربے کے ساتھ ساتھ غالب نے اپنے فن میں علامتوں اور اشاروں کے استعمال کا بھی ایک اہم تجربہ کیا ہے۔ علامتوں اور اشاروں کا استعمال تو غالب سے قبل بھی اردو شاعری کی روایت میں عام تھا۔ خصوصیت کے ساتھ غزل کے فن میں اس کی ایک روایت موجود تھی۔ لیکن غالب نے اس روایت کو کچھ اور بھی اُستوار کیا۔ اُنھوں نے غزل کی روایتی علامتوں اور اشاروں میں نیا خونِ زندگی دوڑایا۔ اور اپنے وسیع اور ہمہ گیر موضوعات کو ان کے ذریعے سے ظاہر کرنے کی کوشش کی۔ اس طرح یہ روایتی علامات و اشارات نئی معنویت سے آشنا ہوئے۔ اور ان کے دامن میں نئی وسعتیں پیدا ہوئیں۔ لیکن غالب اپنے موضوعات کی گہرائی اور گیرائی کے پیشِ نظر اپنے اظہار و ابلاغ کو صرف ان علامتوں

اور اشاروں ہی تک محدود نہیں کرسکتے تھے انہیں تو اپنے اظہار و ابلاغ کے لئے کچھ نئے اشاروں اور علامتوں کی ضرورت بھی تھی۔ چنانچہ انہوں نے ان نئی علامتوں اور اشاروں کو تخلیق بھی کیا۔ لیکن اس میں بھی ان کی صنّاعی اور ایجاد پسندی کو دخل نہیں تھا۔ اس کا منبع بھی ان کے موضوعات کا اظہار و ابلاغ اور اس اظہار و ابلاغ کا جمالیاتی احساس و شعور تھا۔ اسی احساس و شعور کے زیرِ اثر انہوں نے بعض ایسی علامتوں سے کام لیا جو ان کی جذباتی اور ذہنی کیفیت کے ساتھ مناسبت رکھتی تھیں۔ غالب زمانے کے زخم خوردہ تھے۔ ان کی زندگی میں باوجود شگفتگی اور شادابی، تیزی اور تندی، جولانی اور طرّاری کے ایک سلگنے والی کیفیت تھی۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اس صورتِ حالات کی مناسبت سے خون، آگ، دھواں اور شرر وغیرہ کے نئے اشاروں اور علامتوں سے کام لیا اور ان کے ذریعے سے اپنے فن میں اظہار و ابلاغ کا ایک نیا عالم پیدا کیا۔ پھر ایک بات یہ بھی ہے کہ اپنی اس ذہنی کیفیت کے باوجود وہ زندگی سے مایوس نہیں تھے۔ ان کی نگاہیں تو ایک نئی دنیا کے پیدا ہونے کا منظر دیکھ رہی تھیں۔ چنانچہ اس صورتِ حال نے انہیں سحر، زنجیر، خواب بیداری، ستارے، ماہتاب اور اسی طرح کے بہت سے اشاروں اور علامتوں کی تخلیق کی طرف راغب کیا۔ اور ان علامتوں اور اشاروں میں ایسا جادو تھا کہ غالب کے بعد اردو شاعری میں ان کے استعمال کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا۔ اور موجودہ دور میں جدید سے جدید اردو شاعروں نے ان سے اظہار و ابلاغ کے سلسلے میں

بڑے بڑے کام لئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اُردو شاعری کی دُنیا ہی بدل گئی۔

یہ سب کچھ غالب کا فنّی کارنامہ تھا۔ اُنہوں نے اُردو شاعری میں علامت نگاری کو ایک اسلوب کی حیثیت سے مستقل حیثیت دی اور نہ صرف ابلاغ بلکہ جمالیاتی اظہار کے لئے بھی اس کو اس طرح استعمال کیا کہ اُردو شاعری میں اس نے ایک رُجحان کی حیثیت اختیار کر لی اور غالب جمالیاتی اظہار کے لیئے اس رجحان کو برتنے اور عام کرنے میں اس وجہ سے کامیاب ہوئے کہ وہ اس کی اہمیت کا گہرا شعور رکھتے تھے۔ اور ان کے خیال میں ناز و غمزہ کی بات دشنہ و خنجر میں اور مشاہدۂ حق کی گفتگو بادۂ و ساغر میں کرنا شاعر کے لئے ناگزیر ہے۔

غالب نے اپنے فن میں رمزیت اور ایمائیت کے ایک نئے انداز کو وجود میں لانے کا تجربہ بھی کیا ہے۔ غالب سے قبل اُردو شاعری میں رمز و ایما کی روایت تو موجود تھی لیکن اس میں یہ بانکپن نہیں تھا جو ان کے ہاتھوں پیدا ہوا۔ وہ تہہ داری کی کیفیت نہیں تھی جو ان کے ہاتھوں وجود میں آئی۔ غالب نے اپنے فکر کی نسبت سے اس رمز و ایما کو زیادہ تہہ دار بلکہ کسی حد تک پیچ دار بنا دیا اور اس طرح اس کی حدیں ابہام سے جا ملیں۔ یہ ابہام آج کی شاعری کے لئے ایک اسلوب کی حیثیت رکھتا ہے۔ غالب نے آج سے سو سال قبل اس ابہام کو ایک اسلوب بنا دیا۔ لیکن ان کا کمال یہ ہے کہ ابہام کو اُنہوں نے اپنے حدود

میں رکھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے یہاں ابہام سے زیادہ اس کی لطافت کا احساس ہوتا ہے اور جو ابہام ان کے یہاں نظر آتا ہے اس کو ایک لطیف ابہام کہنا چاہئے۔ یہ لطیف ابہام اس رمزیت اور ایمائیت ہی کی ایک ترقی یافتہ شکل ہے جس کو غالب نے بڑی چابکدستی کے ساتھ اپنے فن میں برتا ہے۔

اس رمزیت، ایمائیت اور لطیف ابہام کی وجہ سے اُردو شاعری کو ایک نیا اسلوب ملا۔ یہ اسلوب غالب کے ساتھ مخصوص ہے۔ اور ان کا فن اس اسلوب ہی سے پہچانا جاتا ہے۔ اس اسلوب نے انہیں اپنے زمانے میں بڑی حد تک اجنبی بنا دیا۔ اور اسی لیے وہ اس زمانے میں عام نہ ہو سکا۔ شاید اس وجہ سے کہ غالب ایک عظیم شاعر اور فن کار کی حیثیت سے اپنے زمانے سے تقریباً سو سال قبل پیدا ہوئے۔ وہ اپنے زمانے میں شاعرِ فردا تھے۔ انہیں موجودہ دور میں پیدا ہونا چاہیئے تھا۔ اُن کا احساس و شعور اور جمالیاتی اظہار موجودہ دور سے مُناسبت رکھتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ موجودہ دور میں اس اسلوب نے تقریباً تمام جدید شاعروں کے دلوں میں اپنی جگہ بنائی اور ان کے فن کا عام معیار یہی اسلوب قرار پایا۔ اس اعتبار سے غالب کی حیثیت ایک ایسے پہاڑ کی ہے جس کے دامن میں پرورش پانے والی ہر چیز اس کی مخصوص آب و ہوا سے مُتاثر ہوتی ہے۔

زبان و بیان کو غالب نے بہ ذات خود ایک فن بنا دیا ہے۔ زبان، اس میں شبہ نہیں، کہ اظہار کا ذریعہ ہے لیکن ایک عظیم شاعر

کے ہاتھ میں اُس کی حیثیت ایک فن کی ہو جاتی ہے۔ ایک ایسا فن جو اظہار و ابلاغ کے ساتھ ساتھ حُسن و جمال کے نور کو بکھیرتا ہے اور شاعری میں ایک چراغاں کی سی کیفیت کو پیدا کر دیتا ہے۔ غالب نے زبان میں ایک اجتہادی شان پیدا کی ہے۔ اس کو رنگین اور پُرکار بنایا ہے۔ اس میں گل بوٹے سے کھلائے ہیں۔ اس میں ایک عجیب طرح کی جگمگاہٹ اور تابانی سی پیدا کی ہے۔ اس کو ہیرے کی طرح تراشا ہے۔ اس میں نئے رنگ بکھیرے ہیں۔ نئے پہلو پیدا کئے ہیں۔ الفاظ کو آسمان پر بکھرے ہوئے ستاروں کی طرح یک جا کیا ہے۔ اس میں تزئین و آرائش نہیں ہے۔ فطرت کا حسن زیادہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حسن کی فطرت اس میں قدم قدم پر اپنا جلوہ دکھاتی ہے۔ غالب نے زبان کی اصلاح نہیں کی ہے۔ لیکن ایک نئی زبان کو پیدا کیا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ ان کی یہ زبان عام لوگوں کی زبان نہیں۔ اس میں ایک ادبی رنگ و آہنگ ہے۔ اور اس کو صحیح معنوں میں شاعری کی زبان کہا جا سکتا ہے۔ غالب سے قبل شاعری کی زبان میں یہ ادبی رنگ و آہنگ کم تھا۔ وہ بولنے کی زبان سے زیادہ قریب تھی۔ فارسی کے اثرات غالب کی پیدا کی ہوئی زبان میں غالب ہیں۔ لیکن ان اثرات کو پیدا کرنے میں ان کی کسی شعوری کوشش کو دخل نہیں تھا۔ فارسی تو ان کے مزاج کا جُز تھی۔ اس کا رنگ تو ان کی شخصیت میں رچا ہوا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ فارسی کا رنگ و آہنگ ان کی زبان میں اجنبی اور نامانوس نہیں معلوم ہوتا۔ برخلاف اس کے وہ تو اس تہذیب کی تمام رنگینیوں اور رعنائیوں کو سامنے لا کھڑا

کر دیتا ہے۔ جس نے غالب کو پیدا کیا تھا۔ اور جس کی رنگینیاں اور رعنائیاں ان سے قبل کئی سو سال تک اس سرزمین پر رنگ بکھیرتی رہی تھیں۔

غالب نے اردو شاعری کو ایک ایسی زبان دی جو صرف رنگین اور پُرکار ہی نہیں تھی۔ اس میں احساس کی شدّت، جذبے کی صداقت، شعور کی گہرائی، فکر کی گیرائی اور نظریے کی پختگی کے کمل اظہار و ابلاغ کی بڑی صلاحتیں تھیں۔ غالب کی شاعری انہیں تمام عناصر سے عبارت تھی۔ چنانچہ یہی عناصر اس مخصوص زبان کی تخلیق کے محرک ہوئے جو غالب کا ایک اجتہادی کارنامہ ہے۔ گذشتہ سو سال میں اردو کے ان تمام شاعروں کے یہاں یہ زبان اپنی جھلک دکھاتی ہے جن کی شاعری میں احساس کی شدت، جذبے کی صداقت، شعور کی گہرائی، فکر کی گہرائی اور نظریے کی پختگی کا امتزاج صحیح جمالیاتی اظہار کا تقاضا کرتا ہے۔

اسی لحاظ سے دیکھا جائے تو غالب جدید شاعری اور اس کے مختلف فنّی رُجحانات اور جمالیاتی میلانات کے پیش رو نظر آتے ہیں۔ اور ان کے فنی اور جمالیاتی اجتہاد کے اثرات کا رنگ و آہنگ نہ صرف جدید شاعروں کی شاعری بلکہ اعلیٰ درجے کے نثر نگاروں کی نثری تخلیقات میں بھی اپنی جھلک دکھاتا ہے۔

غرض غالب بڑے ہی پہلو دار فن کار تھے۔ اُردو شاعری میں وہ ایک ادائے خاص سے نکتہ سرا ہوئے اور ان کا فن یاران نکتہ دان کے لئے صلائے عام کا پیغام ثابت ہوا۔ اُنھوں نے اپنے فن سے جمالیاتی اقدار کی نئی دنیائیں ہی پیدا نہیں کیں، ان اقدار کو موجودہ

دور کے مزاج کا جزو بنا دیا۔ چنانچہ موجودہ زمانے میں غالب کے فن کو جو مقبولیت حاصل ہوئی وہ کسی دوسرے شاعر کے فن کو حاصل نہ ہو سکی۔ دورِ جدید میں مختلف خیالات و نظریات اور مختلف اسالیبؔ و اندازِ بیان رکھنے والے شاعروں اور ادیبوں کو جس طرح غالب کے فن نے متاثر کیا ہے شاید کسی دور میں کسی دوسرے فن کار نے اس طرح متاثر نہیں کیا۔

اس لئے شاید یہ کہنا بے جا نہیں کہ اُردو شاعری کی روایت میں غالب کے فن کی حیثیت وہی ہے جو جغرافیائی اعتبار سے کسی مُلک میں ایک سر بہ فلک پہاڑ کی ہوتی ہے ؎

ادائے خاص سے غالبؔ ہوا ہے نکتہ سرا
صلائے عام ہے یارانِ نکتہ دان کے لئے

اشاریه

الف

٥

ط

ظ

ع

غ

ن

و

ھ

ی



ڈاکٹر عبادت بریلوی

۱۴ اگست ۱۹۲۰ء کو لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم لکھنؤ ہی میں حاصل کی۔ اور لکھنؤ یونیورسٹی سے بی۔ اے آنرز، ایم۔ اے اور پی۔ ایچ۔ ڈی کیا۔ ۱۹۴۴ء میں اینگلو عربک کالج دہلی یونیورسٹی میں صدر شعبۂ اردو مقرر ہوئے۔ ۱۹۴۹ء میں پنجاب یونیورسٹی لاہور میں اردو زبان اور ادب کے استاد کی حیثیت سے کام شروع کیا۔ ۱۹۶۲ء میں لندن گئے اور اسکول آف اورینٹل اینڈ افریقن اسٹڈیز یونیورسٹی آف لندن کے شعبۂ ثقافت ہند و پاکستان میں پانچ سال تک اردو زبان و ادب کے استاد اور ادبی تحقیق کے نگران کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ ۱۹۶۶ء میں وطن واپس آئے۔ آجکل پنجاب یونیورسٹی لاہور میں اردو کے پروفیسر اور صدر شعبہ ہیں۔

تصانیف

(۱) تنقیدی زاویے (۲) اردو تنقید کا ارتقا (۳) روایت کی اہمیت (۴) غزل اور مطالعۂ غزل (۵) تنقیدی تجربے (۶) جدید شاعری (۷) مومن اور مطالعۂ مومن (۸) شاعری اور شاعری کی تنقید (۹) غالب اور مطالعۂ غالب (۱۰) غالب کا فن (۱۱) خطبات عبدالحق (۱۲) مقدمات عبدالحق (۱۳) کلیات میر (۱۴) شکنتلا — کاظم علی جوان (۱۵) ہفت گلشن مظہر علی خاں ولا (۱۶) مادھونل اور کام کندلا — مظہر علی خاں ولا (۱۷) مختصر کہانیاں — سید حیدر بخش حیدری (۱۸) دیوان حیدری (۱۹) تذکرۂ حیدری (۲۰) گلزار چین — خلیل علی خاں اشک (۲۱) رسالۂ کائنات — خلیل علی خاں اشک (۲۲) چار گلشن — بینی نارائن جہاں (۲۳) دیوان مبتلا — عبید اللہ خاں مبتلا (۲۴) ممتاز الامثال — نواب فیض علی خاں ممتاز (۲۵) انتخاب خطوط غالب (۲۶) مراثیٔ جرأت (۲۷) ارض پاک سے دیار فرنگ تک۔

طباعت سرورق رپن پریس لمیٹڈ، لاہور